(7)

تحفہ از
جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی

جہت ساز - دانشور

ڈاکٹر عرش صدیقی

ڈاکٹر طاہر تونسوی

جہت ساز - دانشور

ڈاکٹر عرش صدیقی

تصنیف

ڈاکٹر طاہر تونسوی

الفیصل ناشرین و تاجرانِ کتب
غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

انتساب

بیگم غوثیہ صدیقی

جہاں زیب

اورنگ زیب

دانیال

اور جہاں تاب

کے نام

میں اُس شہر خرابی میں فقیروں کی طرح برسوں
اُسے گلیوں میں، سڑکوں پر،
گھروں کی سرد دیواروں کے پیچھے ڈھونڈتا تنہا
کہ وہ مل جائے تو تحفہ اُسے دوں اپنی چاہت کا!

عرش صدیقی

ترتیب

سُلگ رہا ہے لبوں پر عذابِ گویائی
کہاں سے بات چلائیں، کہاں سے لفظ چنیں

عرش صدیقی

عجزِ ہُنر

اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد نے "پاکستانی ادب کے معمار" کے حوالے سے معروف ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر کتابیں لکھوانے کا اچھا کام شروع کیا مگر حسبِ معمول سرخ فیتے کا شکار ہوگیا اور اکادمی کے چیئرمین کے بدلنے سے پالیسی میٹر بھی بدل گئے، اور یہ مستحق کام بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ بہرحال میرے ذمے عرشؔ صدیقی پر کتاب لکھنے کا کام لگایا گیا تھا جسے میں نے مکمل کر کے اکادمی کے حوالے کردیا تھا مگر صورتِ حال وہی رہی جس کا تذکرہ میں نے ابھی اوپر کیا ہے۔

ڈاکٹر عرشؔ صدیقی پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں میں نہ صرف بلند مقام کے حامل تھے بلکہ شاعری، افسانہ اور تنقید میں انفرادیت بھی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عرشؔ صدیقی کے فن اور شخصیت کے مطالعہ کے لئے جس منصوبہ بندی سے کام کیا گیا وہ ترتیب سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر عرشؔ صدیقی کے تخلیقی و تنقیدی کارناموں کا ہر اعتبار سے بھرپور تجزیاتی مطالعہ کیا جاسکے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نقوش بھی اجاگر کئے جائیں جو ان کی تخلیق و تنقید کے بنیادی عوامل اور ان کی سوچ و فکر اور شعور و آگہی میں فعال کردار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عرشؔ صدیقی کی تخلیقات کو جانچنے کے لئے اہلِ قلم اور ان کے ہمعصر دانشوروں کی آراء سے بھی کام لیا گیا ہے اور خود ان کی تحریروں سے بھی۔ یوں ان کی ادبی خدمات کا ایک مکمل تجزیاتی مطالعہ سامنے آتا ہے۔

اب یہ کتاب "سرکاری سرپرستی" کے بغیر شائع کی جارہی ہے اس لئے کہ سرکاری اداروں کا تو چلن ہی اور ہے ان کی ترجیحات بھی اور ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ الفیصل ناشرین نے اسے اپنے اشاعتی منصوبوں میں شامل کر کے میرا اور اکادمی ادبیاتِ پاکستان کا بوجھ ہلکا کردیا اور اہلِ علم کے سامنے عرشؔ صدیقی کی خدمات کا بھرپور منظرنامہ آگیا۔ مجھے امید ہے کہ اس سے عرشؔ صدیقی کے فن اور شخصیت کے مطالعے کی مزید راہیں کھلیں گی یوں بھی ان کا مجھ پر حق تھا اگرچہ بقول غالبؔ:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تاہم میں نے حتیٰ المقدور کاوش کی ہے اور اسے آپ سب قارئین تک پہنچانے کے لئے خانوادۂ عرش صدیقی کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں، اس لئے میں نے اس کا انتساب بھی ان سب کے نام کیا ہے۔ صرف اطلاع کے لئے یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اس سے قبل میری دو مرتبہ کتابیں "عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے" اور "دنیائے ادب کا عرش" چھپ چکی ہیں یہ تیسری کتاب "جہت ساز - دانشور ڈاکٹر عرش صدیقی" ایک مکمل دستاویز ہے جو میرے نزدیک عرشؔ صدیقی کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

طاہر تونسوی

العائشہ - غالب اسٹریٹ
غفاریہ کالونی، بوسن روڈ، ملتان،
(پاکستان)

محبتوں کا شجرِ سایہ دار

شخص و عکس

مَیں تو وہ شمعِ فروزاں ہوں جسے بُجھنے کے احکام نہیں
مَیں تو سورج ہوں، سیاہی مری دنیا میں کوئی چیز، کوئی نام نہیں!

عرش صدیقی

(۱)

جہاں ذہن بے خوف اور سر اُٹھایا جا سکتا ہے
جہاں علم آزاد ہے
جہاں تنگ خانگی دیواروں نے دنیا کو ٹکڑوں میں منقسم نہیں کیا ہُوا
جہاں الفاظ سچائی کی گہرائی سے نکلتے ہیں
جہاں اَنتھک محنت کاملیت کی جانب اپنے بازو پھیلاتی ہے
جہاں عقل و خِرد کی شفاف ندی کا راستہ بنجر اور مردہ ریگزار میں
گم نہیں ہوتا
جہاں ذہن کو سدا کشادہ ہونے والے خیال اور عمل کی جانب
تیری رہنمائی میسر ہے
آزادی کی اس جنت میں اے میرے باپ! تو میری سرزمین
کی آنکھیں کھول!

ٹیگور کی یہ نظم عرش صدیقی کی سوچ و فکر اور خیال و عمل کی آئینہ داری کرتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ٹیگور نہیں بلکہ عرش صدیقی دعائیہ کلمات ادا کر رہے ہیں اور اس تناظر میں اپنے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں یہ مماثلت مجھے اِس لئے بھی دکھائی دی کہ عرش صدیقی کی بھی یہی آرزو اور تمنا رہی ہے۔ محبت کے ضمیر سے اُٹھنے والی اُن کی ساری حیاتِ مستعار

اسی کرب میں گزری اور وہ بھی دعا کا کشکول اُٹھائے مصافِ زیست کے ہر موڑ پر اسی کیفیت کو پانے کے لئے سرگرداں رہا اور حسن و خیر کے وسیع تر پس منظر میں عقل و خرد کی شفاف ندی میں محبتوں کے گہر بکھیرتا رہا اور تمام زندگی وہ دوسروں کے دلوں میں بھی اپنے دل کی دھڑکن سننے کا تمنائی رہا۔ اس کی نظم دعائے نیم شبی کا دوسرا حصہ اسی تمنا اور اسی آرزو کا غماز ہے :

مِری ننھی بچی منزہ کہ جس کو
ابھی اس کی امی
بہت پیار کرتے ہوئے سوگئی ہے
مجھے میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دِکھلا رہی ہے
کہ ہو کر جواں جب
وہ امی کے حُسنِ سکوں بخش کی یاد تازہ کرے گی
تو اک اجنبی جانے کس شہر سے کون سے راستے سے
سجائے ہوئے اپنے ماتھے پہ تاروں کا سہرا
مِرے پاس آئے گا اپنے مقدر کا زور آزمانے
مَیں اُس کی خوشی کے لئے زندگی کے اثاثے کو قرباں کروں گا
وہ ہنستا ہوا مسکراتا ہوا میری تسکینِ جاں کو
مرے لختِ دل کو مرے مرکزِ آرزو کو
نہ جانے کہاں کون سے دیس کی کون سی وادیوں میں مقید کرے گا
مَیں اُس آنے والے زمانے کی تصویر ہر شب
دریچوں میں کمروں میں صحنوں میں سجتی ہوئی دیکھتا ہوں

اور اپنے خدا سے
امر ہو کے مجھ سے جدا رہنے والے خدا سے
فقط اک دعا --- ایک اتنی دعا مانگتا ہوں
کہ اس اجنبی کا بھی میرا سا دل ہو

ماضی حال اور مستقبل کی تمام تر صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہوئی یہ نظم بظاہر جذباتی مگر بہ باطن سنجیدگی کا پہلو لئے ہوئے ہے اور انفرادی سطح سے اجتماعی سطح تک آجاتی ہے اور یوں عرش صدیقی کے قلب و نظر کا زاویہ آفاقی ہوجاتا ہے اور شاعری جزوِ پیغمبری کے مصداق وہ انسان کا نجات دہندہ بن جاتا ہے یا اس کی آرزو کرتا ہے۔ عرش صدیقی کی نظم "مرے وحشی جہانِ نو" کا آخری ٹکڑا دیکھئے:

مرے وحشی جہانِ نو
مجھے تسخیر کرنا ہے
تری تہذیبِ حاضر کے
دلِ بے حس کو --- وحشی کو
صلیبِ ابنِ مریم رکھ کے کاندھے پر
شعاعِ علم گوتم لے کے آنکھوں میں
محمدؐ کی وفا کا ہاتھ میں اونچا علم لے کر
ہوئی تحریر جس سے لوحِ آدم وہ قلم لے کر
متاعِ فن، متاعِ زندگی ہر دو بہم لے کر

متاعِ فن اور متاعِ زندگی کے سلسلے میں عرش صدیقی کا یہ رویہ تمام عمر اُن کا ہمسفر رہا اور وہ عملی طور پر انہیں رویوں کے پرچارک رہے، اور نہ صرف

ان کی پاسداری کرتے رہے بلکہ اپنے دوستوں سے بھی ان کی پاسداری کراتے رہے، اور بظاہر یہ اظہار کرتے ہوئے کہ "رائیگاں آزادیوں کے بے ثمر اُنچاس سال" وہ ہمیشہ "محبت لفظ تھا میرا" سے نہ صرف اپنی جھولیاں بھرتے رہے بلکہ اسے متاعِ فقیر کی طرح بانٹتے بھی رہے۔

(۲)

خاندانی پس منظر

عرش صدیقی کے شجرۂ نسب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا سلسلہء نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ اِس خاندان کے بزرگ یمن اور سیستان میں آباد رہے۔ وہاں سے اِس خانوادے کے ایک بزرگ قاضی قوام الحق کے والدین آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں ہندوستان چلے آئے اور روہتک میں آباد ہوئے۔ یہ شجرہ آثم صدیقی (۱۸۹۵ - ۱۹۴۴ء) نے مرتب کیا ہے۔ جسے مالآثر الاجداد کے مصنف منظور الحق صدیقی نے پہلا مکمل شجرہ تسلیم کیا ہے۔ قاضی قوام الدین کے فرزند اکبر افتخار الدین کی اولاد سے سلسلۂ افتخاریہ کا آغاز ہوا۔ عرش صدیقی اسی سلسلۂ افتخاریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مکمل شجرہ درج ذیل ہے:

شجرہ

عرش صدیقی کے خاندان کے بارے میں معلومات مالآثرالاجداد[1] از منظور الحق صدیقی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ عرش صدیقی کے دادا رشید الرحمٰن (۱۸۵۶ - ۱۹۲۸ء) کا قد میانہ، بدن بھاری، رنگ گورا تھا۔ ان دنوں میں ریاستیں اپنے اردگرد کے برٹش اضلاع میں اپنے معاملات کی پیروی کے لئے اپنے نمایندے بھیجا کرتی تھیں جنہیں وکیلِ ریاست کہا جاتا تھا اور جن کی حیثیت سفیر کی سی تھی ۔ آپ کئی سال تک حصار میں ریاست پٹیالہ کے وکیل رہے۔ پھر میونسپل کمیٹی بھوانی ضلع حصار میں بائیس برس تک انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ چونگی

رہے۔ ریٹائر ہوکر مہم آگئے جہاں انتقال ہوا۔ رشید الرحمٰن کے دو بیٹے تھے حبیب الرحمٰن اور بشیر الرحمٰن۔ حبیب الرحمٰن عرش صدیقی کے چچا اور بشیر الرحمٰن والد تھے۔ ان کے چچا حبیب الرحمٰن محکمہ ٔ ڈاک و تار میں سب پوسٹ ماسٹر تھے۔ ان کا انتقال عارف والا ضلع منٹگمری میں ہوا۔ ان کے اکلوتے فرزند محبوب الرحمٰن ملتان میں واپڈا کے شعبہ ٔ برقیات میں ہیڈ کلرک رہے۔

عرش صدیقی کے والدِ محترم بشیر الرحمٰن (١٨٩٦ - ١٩٥٢ء) محکمہ برقیات میں ڈویژنل ہیڈ ڈرافٹس مین کی اسامی سے ریٹائر ہوئے۔ ایک اور اطلاع کے مطابق بشیر الرحمٰن منڈی جوگندر نگر میں ہائیڈرو الیکٹرک سکیم میں نقشہ نویس تھے۔ ١٩٤٣ء میں ان کا تبادلہ لدھیانہ ہوگیا جہاں وہ قیامِ پاکستان تک مقیم رہے اور بعد میں ٦۔ ستمبر ١٩٤٧ء کو لاہور آگئے۔ یہیں ان کا انتقال ١٨۔ اکتوبر ١٩٥٣ء کو ہوا۔ (منظور الحق صدیقی نے ١٩٥٢ء لکھا ہے جو درست نہیں ہے)۔

پیدائش - بچپن - تعلیم

عرش صدیقی کی پیدائش ان کی والدہ شاہجہاں بیگم کے ہاں ٢١۔ جنوری ١٩٢٧ء[٢] بروز جمعہ گورداسپور میں ہوئی، جہاں ان کا بچپن گزرا۔ خاندانی روایات کے مطابق ان کا نام ارشاد الرحمٰن رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم گورداسپور میں اپنے نانا قاضی مقصود علی کے ہاں حاصل کی۔ گورداسپور کے علاوہ بچپن کے بے فکری کے ایام کانگڑہ کے مختلف شہروں اور لدھیانہ میں بسر کئے۔ چار سال کی عمر میں جوگندر نگر کے مڈل سکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت کے ابتدائی چند ماہ گورنمنٹ ہائی اسکول بھوانی (حصار) میں داخل رہے، مگر امتحان گڑ گاؤں کے ہائی سکول سے پاس کیا۔ ١٩٤٧ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے ایف ایس سی کیا اور پھر والد کے ساتھ ہجرت کرکے لاہور آگئے۔ ١٩٤٩ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ١٩٥٢ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ مگر ١٨۔ اکتوبر ١٩٥٣ء کو والد کے انتقال اور گھر کے نامساعد حالات کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ

منقطع کرنا پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ یاد رہے کہ اُس وقت میٹرک سے لے کر ایم اے تک کے سارے امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تحت ہوتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے عرش صدیقی کو راوین کا اعزاز حاصل ہے۔

ملازمت

والد کے انتقال کے بعد کئی سال بڑی تنگدستی کے گزرے مگر عرش صدیقی نے ہمت نہ ہاری اور ٹیوشن پڑھا کر گھر کا خرچ چلاتے رہے۔ ایم اے انگریزی کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۵۵ء میں اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں عارضی ملازمت مل گئی جہاں ڈاکٹر وحید قریشی اور مظفر علی سید بھی ان کے رفیق کار تھے۔

پبلک سروس کمیشن سے سلیکشن پر ۱۵۔ نومبر ۱۹۵۷ء کو گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول مظفر گڑھ میں تعیناتی ہوئی۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں آپ کا تبادلہ گورنمنٹ انٹر کالج سول لائنز ملتان (موجودہ گورنمنٹ کالج سول لائنز) ہوگیا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں ایمرسن کالج ملتان آگئے اور ۱۹۷۵ء تک وہیں رہے۔ ملتان یونیورسٹی کے قیام پر وہ یکم نومبر ۱۹۷۵ء تا ۱۵۔ جون ۱۹۷۸ء تک شعبۂ انگریزی کے پہلے چیئرمین رہے۔ بعد میں ان کا سلیکشن بحیثیت رجسٹرار ہوگیا اور وہ ۱۶۔ جون ۱۹۷۸ء تا ۲۰۔ جنوری ۱۹۹۰ء تک رہے اور اس عہدے پر متمکن رہ کر یونیورسٹی کے لئے شاندار خدمات سرانجام دیں۔ اسی وجہ سے ان کی مدتِ ملازمت میں توسیع کی گئی۔ بعض اختلافی سلسلوں کے باوجود انہوں نے اپنا وقت نہایت عزت اور وقار سے گزارا۔

شادی

آپ کی شادی ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو غوثیہ صدیقی سے سرانجام پائی۔ آپ کے سسر جمشید علی صدیقی ہریانہ ٹرانسپورٹ کمپنی ملتان میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ غوثیہ

صدیقی پہلے ٹیچر رہیں پھر ایم اے اردو کرنے کے بعد لیکچرار ہوگئیں اور بطور اسسٹنٹ پروفیسر اردو ریٹائر ہوئیں۔ غوثیہ صدیقی ایک بیوی کی حیثیت سے نہایت ہی کامیاب رہیں اور انہوں نے عرش صدیقی کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا اور گھرداری کے تمام بکھیڑوں کا بڑی ذمہ داری سے بیڑا اٹھائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرش صدیقی کو اپنی بیگم سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت تھی اور یہ گھرانہ ہر اعتبار سے ایک مثالی گھرانہ تھا۔ اپنے آخری انٹرویو میں ''خبریں'' کے انٹرویو نگار کے اس سوال کا کہ کیا آپ نے کبھی عشق کیا، جواب دیتے ہوئے عرش صدیقی نے کہا:

''میں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا البتہ ایک دو جگہ ممکن تھا کہ اگر میں چاہتا تو یہ سلسلہ چل سکتا تھا بلکہ ایک جگہ تو مجھے شائبہ تک ہوگیا تھا کہ عشق ہوگیا ہے لیکن بعد میں علم ہوا کہ اُن کی شادی ہوگئی ہے۔ بہرکیف اس کے بعد جب میری شادی ہوئی تو اپنی بیوی سے عشق کیا اور کبھی کسی کا احساس نہیں ہوا۔ میری بیوی جیسی خاتون اس دنیا میں کم ہی ہوگی''۔

اور اس میں حقیقت بھی ہے کہ اُس جیسا مثالی جوڑا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

اولاد

عرش صدیقی کے ہاں پہلی بچی منزہ کی پیدائش ۲۷۔ اگست ۱۹۵۹ء کو ہوئی مگر وہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس کا صدمہ انہیں بہت ہوا۔ اپنی چھوٹی بچی کے لئے انہوں نے ''دعائے نیم شبی'' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی جو ''دیدۂ یعقوب'' میں شامل ہے۔ عرش صدیقی کو منزہ سے گہری محبت تھی اور اس کی یادیں تمام زندگی ان کے ساتھ رہیں، اس لئے انہوں نے اپنے مکان کا نام المنزہ رکھا۔ راغب مرادآبادی نے منزہ کی یاد میں دو رباعیاں کہیں جو درج ذیل ہیں:

دن ہو کہ ہو خواہ رات پیاری بیٹی
ڈستی ہے یہ کائنات پیاری بیٹی

شاہد ہے خدا عرشؔ شکستہ دل کو
یاد آؤگی تا حیات پیاری بیٹی

کس طرح نہ پارہ پارہ ہو عرشؔ کا دل
کشتی ڈوبی ہے اس کی نزدِ ساحل
آغوشِ لحد میں ہے منزہ لیکن
ملتان میں قائم ہے منزہ منزل

(۱۴۔ اپریل ۱۹۸۴ء)

دوسرے بچوں کی تفصیل یہ ہے۔

جہاں زیب	۱۲۔ جنوری ۱۹۶۵ء
اورنگ زیب	۱۸۔ جنوری ۱۹۶۷ء
احمد دانیال	۳۔ مارچ ۱۹۶۹ء
جہاں تاب	۱۱۔ مارچ ۱۹۷۳ء

جہاں زیب ڈاکٹر ہیں اور سینٹ جان (کینڈا) میں مقیم ہیں۔ اورنگ زیب کراچی میں کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ احمد دانیال نیویارک میں ڈاکٹر ہیں۔ جہاں تاب نے ایم بی بی ایس کیا ہے مگر شادی کے بعد ملازمت نہیں کی۔ تاہم اجازت ملنے پر آج کل نشتر ہسپتال ملتان میں ہاؤس جاب کررہی ہیں۔

ادب سے وابستگی

عرشؔ صدیقی کو ادب سے دلچسپی ورثے میں ملی۔ ان کا پورا خانوادہ علمی و ادبی تھا اور ان میں قاضی، علماء اور مفتیان پیدا ہوئے اور ان میں سے بعض شعر گوئی بھی کرتے تھے اس کی تفصیل مآثرالاجداد میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ خان بہادر محمد حسین عارف (۱۸۵۶ - ۱۹۲۸ء) ادب و شعر سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اورئینٹل کالج لاہور میں صدر شعبۂ اردو بھی رہے۔ ان کی نثر میں ۱۲ اور شاعری میں ۲۳ تصانیف ہیں جن میں قصیدہ بردہ

شریف کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری[۳] رقمطراز ہیں:

''بعض شعراء نے بوصیری کے قصیدۂ بردہ کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ خان بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف کا منظوم اردو ترجمہ خاتونِ پاکستان کراچی (۱۹۶۴ء) رسول نمبر میں صفحہ ۱۹۱ پر شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ میری نظر سے گذرا ہے ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے''۔

منظور الحق صدیقی نے ان کے بارے میں پیرزادہ محمد حسین عارف ''احوال و آثار'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور مآثرالاجداد میں بھی ان پر تفصیل سے قلم اُٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:[۴]

''پیرزادہ صاحب طبعاً شاعر نہیں تھے انہوں نے چالیس سال کی عمر ہونے پر پہلی مرتبہ شعر کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ فرماتے ہیں:

عمر ہے چالیس سے بھی کچھ سوا
شعر اک موزوں نہیں اب تک ہوا

جن عظیم اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فیض اُٹھایا ان میں ایک مولانا محمد حسین آزاد تھے .....ارشد گورگانی سے اصلاحِ سخن کا خود ذکر کرتے ہیں''۔

منظور الحق صدیقی نے ان کی شاعری کی جن تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔ ریویو مثنوی اسرارِ خودی (فارسی)، قطعاتِ تاریخ (فارسی)، عقدِ گوہر یا موتیوں کا ہار، قصیدہ بردہ کا منظوم اردو ترجمہ، منظوم ترجمہ آیت الکرسی، خیر مقدم، جوان بیٹے کو باپ کی وصیت اور آئینۂ کشمیر قابلِ ذکر ہیں۔ اب سے ساٹھ برس پہلے کشمیری مسلمانوں کی جو دردناک حالت تھی اس کا نقشہ آپ نے نظم آئینۂ کشمیر[۵] میں اس طرح کھینچا ہے:

اگرچہ ہر جگہ افلاس کا غلبہ ہے خطہ میں
مسلمانوں کا لیکن حال یاں بالکل بُرا دیکھا

نہ اِن میں علم اور دولت نہ عزت اور حکومت ہے
تجارت کے اصولوں سے اُنہیں ناآشنا دیکھا

نہ ہے دربار میں اُن کی رسائی اور نہ لشکر میں
مگر ہاں کفش برداروں میں اک دو کو کھڑا دیکھا

یہ نظم ۱۹۰۷ء میں کہی گئی۔ ان کی شاعری کی بارے میں مزید تفصیلات مآثرالاجداد میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

عرشؔ صدیقی کے پردادا فضل الرحمٰن (۱۸۲۰ - ۱۸۹۲ء) کو شعر گوئی کا شوق تھا مگر اُن کا کلام ضائع ہوگیا۔ عرش کے دادا رشید الرحمٰن (۱۸۵۶ - ۱۹۲۸ء) بھی شاعر تھے اور قاضی و رشید تخلص کرتے تھے۔ کلام ضائع ہوگیا، صرف چند اشعار جو منظور الحق صدیقی [۲] نے ان کی دختر سے حاصل کئے ہیں درج کئے جاتے ہیں :

پوچھتے گھر مرے آئے کہ یہ گھر کس کا ہے
بے بلائے چلے آئے یہ اثر کس کا ہے

سر مرا دیکھ کے مقتل میں تجاہل کے طریق
ٹھوکریں مار کے پوچھا کہ یہ سر کس کا ہے

چلے جو دوش عزیزاں پہ سوئے گورستاں
عدم میں شور تھا پیدل گئے سوار آئے

یہ تو پوچھیں مرے مرقد سے گزرنے والے
کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے

ادب سے وابستگی

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ادب سے دلچسپی اور وابستگی عرشؔ صدیقی کو

ورثے میں ملی ہے۔ علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ ہونے کی نسبت سے انہیں لکھنے پڑھنے سے شغف ہوا۔ سکول کے زمانے میں ان کے استاد ماسٹر فضل الرحمٰن جماعت میں اکثر حافظ محمود شیرانی اور اختر شیرانی کا تذکرہ کرتے تھے اور اختر شیرانی کے مداح تھے۔ عرشؔ صدیقی سے ان کی باتیں سن کر اختر شیرانی سے متعارف ہوئے اور وہ انہیں بچپن ہی سے پسند تھے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی خود اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا کے بارے میں کہتے ہیں کہ :

"لکھنے پڑھنے کا شوق چھٹی ساتویں جماعت ہی سے ہوگیا تھا میری زندگی کی ابتدائی تربیت سولہ برس گورداسپور میں جہاں میں پیدا ہوا اور کانگڑہ کے خوبصورت شہروں میں ہوئی جہاں پرائمری جماعتوں میں ہندی لازمی ہونے کی وجہ سے مجھے ہندی زبان پڑھنے کا موقع ملا۔ اسکول کے انہیں دنوں مجھے رامائن اور مہابھارت کی کئی کہانیاں ہندی زبان میں پڑھنے کا موقع ملا۔ بعد میں مَیں نے رامائن اور مہابھارت کو تفصیل سے پڑھا۔ آپ یقین کریں گے کہ آٹھویں جماعت پاس کرنے سے پہلے میں طلسم ہوشربا، فسانۂ آزاد اور داستانِ امیر حمزہ کو مکمل طور سے پڑھ چکا تھا ..... میرا خیال ہے کہ ان اتفاقات کا میرے آئندہ برسوں میں ادیب اور شاعر بنانے میں بہت دخل تھا"۔

یہ بات درست تسلیم کی جاسکتی ہے تاہم عرش صدیقی نے شعوری طور پر لکھنے کا آغاز ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کیا۔ ان کے بقول :

"میری تخلیقی زندگی کا آغاز غزل سے ہوا اور پہلی غزل ۱۹۵۱ء میں نیرنگِ خیال میں چھپی۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۵۵ء میں رسالہ "دستور" جس کے مدیر اصغر پوری تھے، میں شائع ہوا جس کا نام تھا "اک جہاں سب سے الگ"۔

عرش صدیقی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنا تخلیقی

سفر غزل سے کیا اور ایک سوال کے جواب میں انہوں نے اسے "صنفِ نازک" بتایا۔ بعد میں وہ نظم کی طرف آئے۔ روزنامہ جنگ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اظہارِ خیال کیا کہ :

"میرے خیال میں غزل اردو شاعری کی سب سے توانا مقبول اور کامیاب صنف ہے اور یہ بات غزل کے ارتقاء کے مطالعے اور انسانی فطرت کے پیشِ نظر کہی جاسکتی ہے کہ اردو غزل کی مقبولیت اور کامیابی کبھی مشکوک نہیں ہوئی۔ میں نے شاعری کا آغاز جیسا کہ نوجوان عموماً کرتے ہیں غزل ہی سے کیا، لیکن پھر دوسری زبانوں بالخصوص یونانی، انگریزی، فرانسیسی اور امریکی شاعری کے مطالعے نے مجھے نظم کی طرف مائل کیا۔ میرے ذہن میں یہ خوف بھی رہا کہ غزل میں اتنا عظیم اور اعلیٰ سرمایہ موجود ہے کہ اس میں اضافہ مشکل ہے۔ جبکہ نظم بالخصوص آزاد نظم میں تخلیقی کام کے امکانات بہت ہیں"۔ ۷

منظور الحق صدیقی نے مآثرالاجداد میں عرش صدیقی کے تعارف کے بعد ان کی کئی ابتدائی غزلیں بھی رقم کی ہیں :

چمن سے اُٹھ کے وہ گل جائیں تو کہاں جائیں
جنہیں وطن کی فضائیں نہ سازگار آئیں

(مطبوعہ لالہ زار لاہور)

اُٹھادو رنج مگر، کم لگن نہ ہونے دو
مردہ، یارو فضائے چمن نہ ہونے دو

(مطبوعہ امروز-لاہور)

ترے شہر میں زبوں ہیں شب و روز مے گساراں
کبھی محتسب کا کھٹکا کبھی خوفِ شہر یاراں

(مطبوعہ قندیل لاہور)

اگرچہ مرگ داماں تھی غم کی پہنائی
ترے خیال میں ڈوبے تو زندگی پائی

(مطبوعہ یادگار لاہور و معیار گجرات)

دل خوں ہے دل کا حال رقم ہو تو کس طرح
دل سے قلم کا فاصلہ کم ہو تو کس طرح

(مطبوعہ لیل و نہار لاہور)

ایک بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ عرش صدیقی نے پہلے ستم گورداسپوری پھر عاجز گورداسپوری اور پھر عرش تخلص اختیار کیا۔ عرش صدیقی کی ادبی تربیت میں ادبی انجمنوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ لاہور میں عارف عبدالمتین اور ناز ش کاشمیری کے ساتھ حلقہء اربابِ ذوق کی محفلوں میں شرکت کی۔ بعد میں انجمن آزاد خیال مصنفین قائم کی جس کے وہ جنرل سیکرٹری بنے۔

رائٹرز گلڈ کے قیام کے بعد ۲۲۔ جون ۱۹۵۹ء کو ملتان شاخ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ عرش صدیقی ۱۷۔ اگست ۱۹۶۲ء کو اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اور ۲۵۔ جون ۱۹۶۶ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے اور یہ زمانہ ملتان میں ادبی سرگرمیوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ بعد میں گلڈ سے اختلافات کی بنا پر مستعفی ہوگئے اور اردو اکادمی کے پلیٹ فارم کے تحت نہ صرف ادب کی خدمت کرتے رہے بلکہ اس پر مستقل اثرات بھی مرتب کئے۔

عادات و خصائل، شخصی رویے و کردار

عرش صدیقی عادات و خصائل اور شخصی رویوں اور روایات کے لحاظ سے پیغمبرانہ صفات کے حامل تھے۔ شرافت، صلح جوئی، ملنساری، خلوص و محبت اور اس جیسی خاصیتوں کو ملا کر ایک پیکر تراشا جائے تو اس سے یقینی طور پر عرش صدیقی کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ اقدار کی پاسداری کرنے والا یہ شخص و شاعر عہدِ بے ہنر میں اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا۔ مگر اپنی خوشیوں کی

بدولت زندہ و پائندہ ہے۔ شاید غالبؔ نے ان کے بارے میں کہا ہو :

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کو چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ روشناسِ خلق بھی تھا اور نباضِ دوراں بھی تھا۔ وہ محبتوں کا شجرِ سایہ دار بھی تھا اور وضع دار رکھ رکھاؤ رکھنے والا ایسا شخص تھا کہ بس اُسے دیکھ کر اُسے چاہے جانے کی خواہش کے علاوہ کوئی خیال بھی نہیں آتا تھا۔

عارف عبدالمتین نے اپنے مضمون "عرش صدیقی کی شخصیت"[۸] میں ان کی کئی پرتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"باور کیجئے کہ جب نازش کاشمیری نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان سے ملئیے، یہ ہیں عرش صدیقی ! تو میں نے معاً محسوس کیا کہ مجھے LOVE AT FIRST SIGHT کا تجربہ ہو رہا ہے۔ میری روح نے عرش صدیقی کی باوقار شخصیت کی ظاہری خوبیوں اور باطنی حسن کا آناً فاناً ادراک کیا اور پہلا خیال جو میرے ذہن میں کوندے کی طرح لہرایا وہ یہ تھا کہ عرش صدیقی میں واقعی عرش کی سی رعنائیاں بھی ہیں، وسعتیں بھی ہیں اور رفعتیں بھی ہیں اور انہوں نے اپنے تخلص کو شعورِ ذات کے مظہر کے طور پر اپنایا ہے .... عرش صدیقی کے رنگ میں صباحت تھی، شخصیت میں دلکشی تھی اور گفتار میں ایسی صداقت تھی جو کوائف کے معروضی مطالعے اور علم کے سائنسی حصول کے فیضان سے نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک تھی جسے ان کے چشمہ نے فزوں تر کر رکھا تھا، اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لطیف لہر تھی جو ایک آن بھی قہقہہ کے طوفان میں ڈھلنے کے لئے تیار نہ تھی"۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر شخص عرش صدیقی کی محبتوں کا قائل اور ان

کی انسانی خوبیوں کا مداح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارف عبدالمتین[9] نے صحیح لکھا ہے:

"عرش صدیقی ہر اعتبار سے ایک ایسی منوہر شخصیت کے مالک ہیں کہ ان سے ملنے کے بعد کوئی بدنصیب انسان ہی اُن سے والہانہ پیار کئے بغیر رہ سکتا ہے، مگر ان کا وجود شانِ دلربائی پیدا کرنے والے عناصر کی آماجگاہ نہیں۔ ان کی ہستی بذاتِ خود محبت کے ایک عظیم منبع کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عرش صدیقی سراپا محبت ہیں اور محبت کا دوسرا نام عرش صدیقی ہے"۔

عرش صدیقی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اگرچہ بہت کم لوگوں نے قلم اُٹھایا ہے تاہم جن لوگوں نے اُن کی شاعری سے ہٹ کر ان کی ذات کے بارے میں لکھا ہے انہوں نے عرش صدیقی کی ہمہ جہت شخصیت کے کسی نہ کسی اہم گوشے کی نشاندہی ضرور کی ہے اور اس حوالے سے عرش صدیقی کی جو تصویر ابھری ہے وہ ہر اعتبار سے من موہنی اور کومل ہے۔ رحیم گل نے "ملتان کے چار درویش"[10] کے نام سے جو خاکہ لکھا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے اور انہوں نے کوزے میں دریا کو بند کردیا ہے لکھتے ہیں:

"دوسرا درویش عرش صدیقی ہے یہ عجیب و غریب شخصیت ہے، بے حد خوبصورت، بے حد توانا، بے حد بھرپور۔ عرش صدیقی زکریا یونیورسٹی میں رجسٹرار جیسے باوقار بااختیار اور قابلِ احترام عہدے پر فائز ہے، لیکن خُوبو سے نرا قلندر - افسری انہیں چُھو کر نہیں گئی اور کرسی نالاں کہ امیروں کے بھیس میں یہ فقیر مجھ پر کیسے براجمان ہوگیا۔ ملتان میں کوئی ادبی تقریب ہو، کوئی کراچی سے ہوائی جہاز میں آئے یا پشاور سے ٹرین میں یا لاہور سے پیدل ملتان پہنچے، عرش صدیقی کے ڈیرے پر پہنچے گا۔ تعارف ہو نہ ہو، دوستی ہو نہ ہو، بس یہی کافی ہے کہ مہمانِ عزیز ادب کا رسیا ہے۔ بن بلائے مہمان کو اگر تھوڑی بہت شرم آتی بھی ہے تو عرش صدیقی سے مل کر ختم ہوجاتی ہے کیونکہ اس

سے عارف عبدالمتین کی خوشبو آتی ہے پہلی ہی ملاقات میں تسخیر کرنے والا، دل موہ لینے والا عرش صدیقی واقعی عزت کے لائق ہے"۔

میں نے ایک زمانے میں روزنامہ مشرق لاہور میں مختصر خاکے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور عرش صدیقی" کا بھی خاکہ تحریر کیا تھا اس میں سے چند باتیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

"عارف عبدالمتین صلاح الدین ندیم اور عرش صدیقی کی شکلیں آپس میں بہت ملتی ہیں نظمیں بھی ایک جیسی ہی لکھتے ہیں۔ اس سے میرا مطلب موضوعات سے ہے۔ عرش صدیقی اور عارف عبدالمتین کا انداز بھی ایک سا ہے۔ دونوں بے پناہ محبت کرنے والے ہیں اور کتابوں کے طویل ترین دیباچے لکھتے ہیں جو اکثر اوقات اصل مسودے کی ضخامت سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ عرش صدیقی ملتان میں اپنی محبتوں کی دکان سجائے بیٹھے ہیں۔ عرش صاحب میرے اُستاد ہیں اور بی اے میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ کالج کی عمارت کے بالائی کمروں میں انگریزی کا پیریڈ ہوا کرتا تھا، عرش صدیقی کلاس لینے کے لئے روانہ ہوتے تو ہم سب کھڑکیوں سے پکارتے آیا آیا --- عرش صاحب سنی ان سنی کردیتے اور سیڑھیاں چڑھ کر کلاس روم میں داخل ہوتے اور سبق پڑھانے لگ جاتے۔ جب یہ بات روز کا معمول بن گئی تو ایک دن عرش صاحب نے کہا کہ بھئی میں آپ لوگوں کو منع تو نہیں کرتا، مجھے علم ہے کہ آپ لوگ باز آنے والے نہیں، مگر اس میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا آیا کی بجائے آئے آئے کہہ لیا کریں۔ اُن کی اس بات سے ہم سب کو ایسی شرم آئی کہ یہ سلسلہ ہی ختم کردیا۔ عرش صدیقی کی گفتگو مصری کی ڈلی ہے۔ عرش صدیقی کی دو کمزوریاں ہیں، ایک فلیٹ کیپ اور دوسرے پائپ۔ اور یہ دونوں چیزیں ان کی شناخت بھی ہیں۔ ایک زمانے میں

بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی تھیں اس حوالے سے وہ انفرادیت پسند ہی نہیں انفرادیت پرست بھی ہیں۔ سر پر فلیٹ کیپ، منہ میں پائپ دبائے جاذبِ نظر سوٹ پہنے جس طرف سے بھی گزرتے ہیں انہیں پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ بہت سے لوگ ان کی اس بات سے جلتے ہیں۔ چنانچہ انہیں میں سے ایک صاحب بازار سے فلیٹ کیپ اور پائپ لے آئے اور دوستوں کے حلقے میں پہنچ کر میز پر زور سے ہاتھ مار کر کہنے لگے بلاؤ عرش صدیقی کو کہاں ہے اس کی انفرادیت! عرش صدیقی دبستانِ ملتان کے صدر الصدور ہیں ایک خاص بات یہ ہے کہ سب لوگ ان کے دوست اور ان سے محبت کرنے والے ہیں"۔

اقبال ساغر صدیقی نے "سب اچھا کہیں جسے" [۱۲] کے عنوان سے جو ہلکا پھلکا مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے عرش صدیقی کی خوبیوں کا اعتراف کیا وہ رقمطراز ہیں:

"عرش صاحب کی ذات ملتان کا حوالہ اور شناخت تھی میں دنیا بھر میں جہاں بھی گیا اور وہاں کے ادبی حلقوں کو جب پتہ چلا کہ میں ملتان سے آیا ہوں تو انہوں نے عرش صاحب کو پوچھا اور ان کی خیریت دریافت کی ان کا فن ان کی خوش اخلاقی، ان کی زندہ دلی، وضع داری اور خلوص ہمیشہ ہم سب کو یاد رہے گا"۔

اور اس میں شک بھی نہیں کہ عرش صدیقی خلوص و محبت کا پیکر تھے اور محبتیں بانٹنے والے تھے۔ لطیف کاشمیری نے "پہاڑوں سے اترا جوگی - ملتان کا درویش"۔ [۱۳] کے عنوان سے ان کا جو بھرپور خاکہ لکھا ہے اس میں عرش صدیقی کی شخصیت کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے وہ ان کی جاندار اور شاندار شخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"اپنے کومل اور رسیلے شبدوں سے آدمی کے دل کا میل اتارنے اور

امن و شانتی اور پریت کی جوت جگانے والا ایک کلاکار جس نے اپنی کویتاؤں اور کہانی کے سہارے کٹھور سے کٹھور آدمی کے ذہن پر دستک دے کر اُسے اپنے دل کے پٹ کھول دینے پر مجبور کیا۔ اُسے بڑھیا سوٹ میں ملبوس اور فیلٹ پہنے دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ وہ بظاہر مغربی وضع قطع اختیار کرنے کے باوجود اندر سے کس قدر ایشیائی مزاج رکھتا ہے، اس کی خوبصورت سوچوں، وضع داری، مروت اور بے نیازی نے اس کی شخصیت کو پرکشش رنگوں سے سجایا ہے اور اس میں نفس طہارت کی ایک ایسی کیفیت نمو پذیر ہوئی ہے جو عموماً رشیوں، ولیوں اور صوفیوں کے پوتر دلوں میں موجزن رہا کرتی ہے۔ اسے کوہساروں کی برف کی اجلاہٹ اور پہاڑوں کی بلندیوں اور بہتے جھرنوں سے خصوصی لگاؤ ہے۔ گرتی برف کی سرسراہٹ اور آبشاروں کا الوہی ترنم اس کی تخلیقی لگن کے سرچشمے ہیں جو اس کی سوچوں اور جذبوں کی اساس بنتے رہے ہیں"۔

لطیف کاشمیری نے جن پہاڑوں، وادیوں، آبشاروں اور جھرنوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا عرش صدیقی کی زندگی سے گہرا تعلق ہے اس لئے کہ انہوں نے زندگی کے سولہ سترہ برس کانگڑہ کی خوبصورت سرزمین میں گزارے ہیں اور اُنہیں پہاڑوں کی ہوائیں اب بھی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اسی جانب لطیف کاشمیری نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"دھرم شالہ کی خوبصورت رومانی فضائیں، گلو اور چنبہ کے جنگلات کے خنک جھونکے، کوہِ شوالک کے درختوں کی عطر بیز ہوائیں اور اس کے چشموں کی حلاوتیں اور لطافتیں اس کے شعور کی تہوں میں کچھ یوں رچ بس گئی ہیں کہ ملتان کی گرد و گرما کی روح فرسا فضائیں بھی انہیں دھندلا نہ سکیں"۔

یہ بات حرف بہ حرف سچ ہے اس لئے کہ عرش صدیقی سوائے پہاڑوں کی

طرف جانے کے باقی مقامات کے لئے انکار کردیتے تھے۔ غالباً ۱۹۹۵ء کی بات ہے کہ عرش صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر اور میں چند دنوں کے لئے مری گئے۔ لطیف کاشمیری نے ہمارے لئے پوسٹ آفس کی بلڈنگ کی دوسری منزل پر رہائش کا بندوبست کیا۔ کمرے کی کھڑکی سے پہاڑوں پر جمی برف اور سرسبز و شاداب درختوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اور یہ منظر عرش صدیقی کی یادوں کے تناظر میں ایک نہایت ہی خوشگوار اور خوش کن بات تھی۔ ظاہر ہے کہ سرد ہواؤں کی وجہ سے میرا اور ڈاکٹر سلیم اختر کا تقاضا یہ تھا کہ کھڑکی بند کردی جائے، مگر عرش صدیقی اس نظارے کو اپنی روح میں جذب کرکے کانگڑہ کی یادوں میں کھوجانا چاہتے تھے نہ مانے، اور ہم لوگ لحاف میں دبک کر سردی سے بچنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اور پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ خدا معلوم عرش صدیقی رات گئے کتنی دیر تک جاگتے رہے مگر صبح ان کی حالت دیدنی تھی اس لئے کہ سرد ہواؤں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نزلہ، زکام اور فلو کی وجہ سے ان کی طبیعت خاصی خراب ہوگئی اور انہیں گرمی بہم پہنچانا پڑی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس دن ہمارے ساتھ باہر نہ نکل سکے، تاہم وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کا متواتر تذکرہ کرتے رہے۔ اسی طرح ۱۹۹۵ء میں جب وہ پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے باڑہ گلی میں منعقدہ سیمینار میں شرکت کے لئے میرے ساتھ تشریف لے گئے تو وہاں بھی انہوں نے پہاڑوں کے دلفریب نظاروں سے خوب لطف لیا مگر اس دفعہ گزشتہ تجربے کی روشنی میں انہوں نے گرم کپڑے پہن رکھتے تھے اور اس طرح وہ سردی سے بچے رہے۔

عرش صدیقی، جیسا کہ تذکرہ ہوا ہے بڑے وضع دار آدمی تھے، اگر کوئی بچہ بھی ان سے ملنے آجاتا تو وہ اس کا بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کرتے اور اُسے چھوڑنے کے لئے دروازے تک جاتے۔ اپنے شاگردوں سے وہ نہایت ہی محبت اور شفقت سے پیش آتے اور ان سے ہمدردی کرتے اور ان کے کام آنے کی کوشش کرتے۔ دوسری جانب شاگرد بھی ان سے ویسا ہی والہانہ پیار کرتے تھے۔

بحیثیت استاد وہ ایک کامیاب معلم تھے اور انہوں نے تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ تربیت کے حوالے سے بھی اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ عارف عبدالمتین[۱۴] لکھتے ہیں :

''انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد لیکچرار کے عہدے پر فائز ہوئے اور حسبِ منشا ماحول پاکر ادب کی سطح پر بھی اپنے جوہر مستعدی سے دکھانے لگے اور درس و تدریس کی سطح پر بھی تفویض علم کا فریضہ پورے انہماک سے سرانجام دینے لگے اور ایک ایسے فاضل اور شفیق اُستاد کے روپ میں ہر دلعزیزی کا اعزاز حاصل کرنے لگے جو اپنے طلبہ میں حسنِ ذوق کے نفاذ کا غیر معمولی ملکہ رکھتا ہو''۔

پروفیسر خالد پرویز عرش صدیقی کے شاگرد رہے ہیں اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''آپ کا طریقِ تدریس جداگانہ اور اندازِ بیان فلسفیانہ ہے، انگریزی بولنے میں وہ روانی جیسے کسی بلند آبشار سے گرتا ٹھنڈا میٹھا پانی --- ہر نکتے کو بار بار سمجھانے کی سعی اور آسان سے آسان لفظ کے معانی --- آپ کے کمرۂ جماعت کی جانی پہچانی کہانی ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں میں مشاق۔ اردو مین تیز تو انگریزی میں رستخیز --- بولتے پنجاب کی زبان، لکھتے پاکستان کی زبان اور پڑھاتے انگلستان کی زبان ہیں، مگر ان سب زبانوں کے علاوہ جس زبان پر آپ کو سب سے زیادہ ملکہ ہے وہ ہے خلوصِ وفا اور محبت لفظ تھا میرا کی زبان --- گویا آپ خوبصورت زبانوں کا ایسا خوبصورت ملاپ ہیں کہ جو مہکے تو گل، چہکے تو بلبل، چٹکے تو غنچہ، سمٹے تو سمٹ کر بھی دریا''۔

افسر ساجد نے ان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ ترسیل[۱۶] میں 'عرش صدیقی کا مختصر خاکہ' میں رقمطراز ہیں :

''نہایت شریف، درویش طبع اور صلح کل انسان ہیں اپنے شاگردوں کی ہمیشہ رہنمائی کرتے ہیں۔ شاگرد بھی ان سے بہت محبت اور

عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ طاہر تونسوی ملتان میں اُنہیں اپنا ڈاکٹر سلیم اختر سمجھتے ہیں۔ فیاض تحسین، ڈاکٹر اے بی اشرف اور ڈاکٹر انوار احمد وغیرہ نے اپنا ادبی سفر ان ہی کی رہنمائی میں طے کیا ہے"۔

منظر امکانی[۱۷] نے "ملاقات" میں اعتراف کیا ہے کہ:

"اس کی شفقت اور محبت سے طلبہ روشنی پاتے ہیں لیکن کلاس روم کے باہر اس کا روپ بدل جاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کے مسائل حل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ان کی کامیابی پر اپنا انعام لینے کے لئے نہیں جاتا"۔

ادب اور ادبی تربیت کا تذکرہ آیا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عرش صدیقی اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے اور انہوں نے نوجوانوں کی جس طرح حوصلہ افزائی کی اور اپنے شاگردوں کو آگے بڑھانے میں جس طرح مثبت کردار ادا کیا وہ تاریخ ادب کا ایک حصہ ہے، مگر اس کے باوجود بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ان کے اس کردار کی نفی کرتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس بات کا زبانی اور تحریری دونوں سطحوں پر اعتراف کیا ہے کہ میری ادبی تربیت میں اور اساتذہ کے علاوہ عرش صدیقی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بی اے کا طالب علم تھا اور عرش صدیقی رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری تھے انہوں نے مجھے ایک تو یہ مشورہ دیا کہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کی جانب توجہ دوں اور پھر گلڈ کے تنقیدی اجلاس میں مضمون بھی پیش کروں۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں مَیں نے "عظمت اللہ کی گیت نگاری" اپنا مضمون تنقید کے لئے پیش کیا اور اس طرح میرا حوصلہ بڑھا۔ یہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں نے اپنے انٹرویو میں برملا اس اعتراف کا اظہار کیا ہے تفصیل یوں ہے:

"ملتان میں جدید شاعری کے فروغ کا کریڈٹ عرش صدیقی کو جاتا ہے کہ جن کی حیثیت شجرِ سایہ دار کی سی ہے انہوں نے جس طرح

نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ادبی تربیت کی ہے اور شعوری و لاشعوری دونوں سطحوں پر جس طرح انہیں متاثر کیا ہے اس کی بنا پر بہت سے نئے لکھنے والے ان کے گرد جمع ہوگئے اور بعض کی نگارشات پر عرش صدیقی کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ عرش صدیقی کی بدولت ملتان میں نظم نگاری کا چرچا ہوا"۔[۱۸]

"ادب میں عرش صدیقی نے میری رہنمائی کی"۔[۱۹]

"ملتان کی پہچان عرش صدیقی ہیں"۔[۲۰]

"عرش صدیقی نے میری حوصلہ افزائی کی"۔[۲۱]

"عرش صدیقی نے تنقید کا بھرم بھی قائم رکھا ہوا ہے"۔[۲۲]

"عرش صدیقی میرے ان اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے میری ادبی تربیت کی"۔[۲۳]

"میری شخصیت کی تشکیل میں جن اساتذہ نے اہم کردار ادا کیا ان میں عرش صدیقی شامل ہیں"۔[۲۴]

ایک خاص بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ عرش صدیقی بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ہر طرح سے اپنے بچوں کی طرح میرا خیال رکھتے تھے اور ہر وقت میری ہمت اور میرا حوصلہ بڑھایا کرتے تھے۔ ان کے جو خطوط میرے نام ہیں ان میں محولہ بالا باتوں کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ان خطوط[۲۵] سے چند ضروری اقتباسات محض ریکارڈ پر لانے کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔

"آپ نے اپنے خط میں ملاقات کی خوشخبری دی ہے اور میں آپ کا منتظر ہوں۔ آپ نے درست کہا کہ میں آپ کی کتاب پر رائے دیتا۔ آپ کو مجھ سے اور مجھے آپ سے بعض توقعات وابستہ کرنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے"۔ (یکم دسمبر ۱۹۷۲ء)

"میں پہلے کبھی ایسی مشکل میں نہیں ہوا تھا، یہ صورتحال اس لئے پیدا ہوگئی کہ جملہ احباب نے آپس میں ہی نااتفاقی کا مظاہرہ کیا، اس کے باوجود میں مایوس نہیں ہوں، آپ جلدی میں کوئی قدم نہ اُٹھائیں، خدا پر بھروسہ رکھیں، وہ انصاف کرے گا اور ضرور کرے گا، میں ہر جائز کوشش کررہا ہوں اور کرتا رہوں گا اور مجھے کامیابی کا پورا یقین ہے"۔ (۳۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

"کل آپ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی اور آپ پریشان ہوئے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر مسائل اور مشکلات نہ ہوں تو انسان کا انسان سے فرق کیونکر معلوم ہو، آپ محقق ہیں اور جانتے ہیں کہ دل چھوڑنے اور حوصلہ کو کمزور ہونے کی اجازت دینے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں اللہ مہربان بھی ہے اور منصف بھی۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ آپ کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوگی۔ کسی مسئلہ کے حل یا کامیابی کے لئے حصول میں تاخیر سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں"۔ (۱۶۔ ستمبر ۱۹۸۴ء)

میرا یہ خط ملنے سے پہلے آپ خانپور کالج کے پرنسپل کے طور پر اپنے فرائض سنبھال چکے ہوں گے۔ خدا مبارک کرے یہ اس کی آپ پر بہت بڑی عنایت ہے یہ منصب آپ کو اہلیت کی بنا پر ضرور ملا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ خدا کی مہربانی سے ملا ہے۔ بہت ہیں اہل لوگ، لیکن دنیا ان کی اہلیت کو نظر انداز کردیتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ تعیناتی آپ کی آئندہ اس سے عظیم تر کامیابیوں کا آغاز اور بہت مبارک آغاز ثابت ہو۔ نظم و ضبط بے حد ضروری ہے اور اسے آپ نے قائم رکھنا ہے۔ آپ کی شخصیت میں جو مثبت رویوں کی توانا لہریں موجزن ہیں ان کے اصل امتحان کا وقت شروع ہوگیا ہے۔ خدا آپ کو کامران کرے۔ سارے سٹاف کو خواہ ان میں اساتذہ

ہوں یا دفتر کے ملازمین۔ مبارک ہو کہ خدا نے بطور پرنسپل ان کو ایک ایسا شخص دیا ہے جو انسانی اقدار پر یقین بھی رکھتا ہے، اور زندگی میں عملاً ان کے معمول میں بھی ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے"۔ (یکم جون ۱۹۸۷ء)

"آپ نے اپنے نئے منصب کی ذمہ داریاں سنبھال لیں، بہت خوشی ہوئی، خدا ہر لحاظ سے مبارک کرے اور آپ کو ہر طرح کامیاب و کامران فرمائے آمین۔ آپ کی شخصیت میں جو بے پایاں خوبیاں مجتمع ہیں ان کی وجہ سے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ نہ صرف اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوں گے، بلکہ خان پور کی علمی و ادبی فضا کو بہت بلند اور اعلیٰ معیار تک لے جائیں گے اور وہاں بھی ایسی عمدہ روایات قائم کریں گے جن پر سب لوگوں کو فخر ہو"۔ (۲۔ جون ۱۹۸۷ء)

"مجھے خوشی ہے کہ اب کی بار میں آپ سے پہلے خط لکھ رہا ہوں سب سے پہلے تو مجھے روایتی بوڑھوں اور بزرگوں کے انداز میں یہ کہنا ہے کہ سردی ان دنوں بہت خراب اثرات دکھارہی ہے اور گھر گھر فلو ہورہا ہے۔ آپ گھر والوں سے دُور ہیں اس لئے ضروری ہے کہ بیمار نہ پڑیں۔ گھر پر تو کوئی نہ کوئی ہمارے ناز اُٹھالیتا ہے، اکیلے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ آپ یہاں تھے تو آپ کو فلو ہوگیا تھا، آپ نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے کام لے کر اس پر جلد قابو پالیا تھا، لیکن قوتِ ارادی بیماری میں ایک سہارا ہوتی ہے علاج نہیں ہوتی۔ اُمید ہے آپ صحت کے بارے میں فکرمند بھی ہوں گے اور محتاط بھی"۔ (۸۔ دسمبر ۱۹۸۷ء)

"آپ کو خدا نے نادر خوبیوں سے نوازا ہے۔ یہ آپ کی بڑی محبت اور کرم فرمائی ہے کہ آپ یہاں سے باہر جاکر بطور خاص مجھے یاد رکھتے

ہیں اور یاد کرتے، ہیں میرے لئے آپ کی یہ محبت بہت اہم ہے اور میرے حوصلے کو اُستوار بنیاد پر قائم کرتی ہے"۔ (۲۲۔جون ۱۹۸۸ء)

"اپنے عزیز اور دوست کی ایک عمدہ کتاب کی اشاعت کی خوشی اپنی جگہ بے حد گہری اور اہم ہے لیکن یہ خوشی دوہری آپ کی اس محبت کی وجہ سے ہوگئی جس کا اظہار آپ نے اپنے پیش لفظ میں کیا"۔ (۵۔اکتوبر ۱۹۹۲ء)

"لگتا ہے ملاقات ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، میں نے دو مرتبہ آپ کے گھر حاضری دی اور چار مرتبہ کالج۔ آپ کے ہاں لمبے لمبے امتحان ہو رہے ہیں آپ نہ مل سکے، ایک بار معلوم ہوا کہ آپ ہیں تلاش کیا، نہیں ملے۔ ایک بار معلوم ہوا کہ صبح تو تھے۔ میں کوئی بارہ بجے کے قریب پہنچا تھا۔ اطلاع ملتی رہی کہ آپ بار بار باہر گئے"۔ (۲۶۔ جنوری ۱۹۹۳ء)

"ہماری زندگی آج ہی نہیں ہمیشہ عزیزوں، دوستوں کی مہربانیوں کی مرہونِ منت رہی ہے اور ان لوگوں میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کو یہ باتیں بتانا اور اپنے مزاج اور رویوں کی وضاحت کرنا اور اس عمر میں، عجیب ضرور لگتا ہے لیکن ضرورت ہو تو ایسا کرنا چاہئیے"۔ (۲۰۔ اگست ۱۹۹۶ء)

نورِ نظر راحتِ جان عزیز محترم!

آپ کا خط مل گیا، خط پاکر آپ کی خیر و عافیت معلوم کرکے خوشی ہوئی۔ یہاں بھی ہر طرح خیروعافیت ہے اللہ کا کرم ہے۔ ہر ہفتے یونہی اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہاکریں تاکہ دل کو اطمینان رہے۔ امید ہے کم لکھے کو زیادہ اور تار سمجھو گے اور یہ خط یعنی تار ملتے ہی ملنے آؤ گے کہ ملے ہوئے یعنی ٹھیک طرح ملے ہوئے مدت ہوگئی"۔

(۲۳۔ جون ۱۹۹۳ء)

اِن اقتباسات سے دکھانا یہ مقصود ہے کہ عرش صدیقی مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے اور میرا ہر طرح سے خیال کرتے تھے بلکہ ایک ستم ظریف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ عرش صدیقی نے بڑھاپے میں طاہر تونسوی سے عشق کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ وہ میرے لئے سب کچھ تھے اور میں آج جو کچھ بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عرش صدیقی بے شمار خصائل کے مالک تھے اور ان کی زندگی گھریلو اور باہر دونوں حوالوں سے ایک آئیڈیل انسان کی تھی۔ وہ ایک اچھے منتظم، بہترین استاد، ہمدرد رفیق کار، قربانی دینے والے دوست، محبت کرنے والے ساتھی اور ایک مثالی کردار تھے۔ لطیف کاشمیری لکھتے ہیں۔[۲۶]:

''جہاں وہ دوستوں سے محبت کرتا، انہیں مفید مشوروں سے نوازتا اور ان کے کسی نہ کسی کام آنے کی تدبیریں کرتا رہتا ہے۔ وہاں اپنے شاگردوں کے ساتھ بھی حقِ دوستی ادا کرنا نہیں بھولتا۔ ایک بار جب طاہر تونسوی نے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دی گئی میعاد کے اندر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنے میں کچھ تساہل برتا اور معیاد کے صرف تین ماہ رہ گئے تو عرش اس صورتِ حال سے پریشان ہوگیا اور اپنے سست رفتار شاگرد سے شاکی رہنے لگا۔ تب اس نے کام کو جلد مکمل کرنے کی اسے سخت تاکید کی اور ساتھ ہی ہدایت کردی کہ جب تک مقالہ مکمل نہیں ہوجاتا مجھے صورت نہ دکھانا۔ طاہر تونسوی ذمہ داری کے شدید احساس اور استادِ محترم کے سامنے سرخرو ہونے کی نیت سے تحقیقی کام میں یوں جٹ گئے کہ انہوں نے دن کا چین اور رات کا آرام بھی تیاگ دیا۔ مگر کچھ دنوں بعد عرش کے ایک دوست کے ہمراہ اسے ملنے اس کے گھر چلے آئے، عرش نے اپنے دوست کو تو گھر بٹھالیا مگر شاگرد کو کہنے لگا تم کیوں آئے

ہو جاو اپنا کام مکمل کرو ..... چنانچہ استاد کے اس نفسیاتی حربے اور مسلسل بازپرس کے نتیجے میں طاہر تونسوی کا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی کی طرف سے دی گئی مدت کے اندر مکمل ہوگیا''۔

غرض عرش صدیقی جامع الصفات شخصیت تھے اور ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

بیماری و انتقال

۲۰۔ جنوری ۱۹۹۰ء کو ریٹائرمنٹ کے بعد اگرچہ انہوں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کی تاہم شوگر کے پرانے مرض نے ان کے قوائے جسمانی کو بے حد کمزور کردیا۔ اور دن بدن ان کی حالت بگڑنے لگی۔ علاج کے لئے وہ کراچی گئے مگر افاقہ نہ ہوسکا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انہیں کینسر ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کراچی سے مجھے ۲۰۔ مارچ ۱۹۹۶ء کو جو خط لکھا اس میں اپنی بیماری کی تفصیلات سے بھی آگاہ کیا لکھتے ہیں :

''مجھے کراچی آئے ہوئے آج پانچواں دن ہے۔متعلقہ ڈاکٹر سے ملاقاتیں بھی ہوئیں اور کچھ ٹیسٹ بھی ہوئے۔ نشتر سے بھی ٹیسٹ کرا آیا تھا مگر یہاں نیا ٹیسٹ کرانا پڑا۔ پنکریاس کی حالت بہت خراب ہے اور صورتِ حال میں مایوسی زیادہ ہے۔ کینسر کا شک گہرا ہے۔ مگر ڈاکٹر کو اصرار ہے کہ بیاپسی کروانا ضروری ہے شاید ایک دو روز میں ہو اس کے بعد طے ہوگا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ میری طبیعت خاصی نڈھال ہے اور بے قابو چل رہی ہے اللہ مالک ہے۔ ابھی یقین سے نہیں معلوم واپسی کب ہوگی .... کنفرم ہوگیا کہ مجھے پنکریاس کا کینسر ہے جسے آپریشن سے نکالنا مناسب ہے نہ ممکن --- اس کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا لیکن اس کے لئے میں لمبے عرصے کو کراچی میں نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ علاج لاہور یا اسلام آباد میں، ترجیحاً

لاہور میں کوشش کریں گے۔ فی الحال یہاں آغا خان ہسپتال میں ایک چھوٹا ضروری آپریشن کروانا ہے تاکہ کچھ سکون طبیعت کو مل جائے ابھی تاریخ نہیں ملی"۔

آپریشن کے بعد عرش صدیقی ملتان آگئے مگر ان کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی گئی میں اور غلام حسین ساجد تقریباً روزانہ ان سے ملنے کے لئے جاتے تھے اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار انہیں مایوس دیکھا، تاہم ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی نہیں گئی تھی۔ اقبال ساغر صدیقی[۲۸] لکھتے ہیں۔

"شدید بیماری اور سخت تکلیف میں بھی ان کی حسِ مزاح برقرار رہی۔ گھر والوں نے جان کے بدلے میں بکرے کا صدقہ دیا تو بکرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے کہ بکرے صاحب ! میرے بجائے یہ لوگ آپ کو بھیج رہے ہیں مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں --- مگر صدقے کے باوجود ان کی تکلیف میں کمی نہ ہوئی تو ایک دن تکلیف سے کراہتے ہوئے کہنے لگے اللہ میاں میری تکلیف کم کردے یا میرا بکرا واپس کردے"۔

ہر انسان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اس لئے عرش صدیقی کے لئے بھی دن مقرر ہوچکا تھا چنانچہ وہ ۸۔ اپریل ۱۹۹۷ء بروز منگل اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ ملکی اخبارات میں ان کے انتقال کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں اور اخبارات میں بہت سے کالم نگاروں اور ادیبوں اور شاعروں نے مضامین لکھے جن میں منو بھائی، ڈاکٹر سلیم اختر، سید ظفر معین، حنیف چوہدری، اظہر سلیم مجوکہ اور پروفیسر خالد پرویز شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ملک بھر سے دانشوروں کے خطوط بھی موصول ہوئے جن میں عرش صدیقی کی ادبی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا گیا بلکہ اُنہیں سراہا بھی گیا اور یقینی طور پر وہ اس کے مستحق تھے۔

حوالہ جات

۱ - مآثر الاجداد از منظور الحق صدیقی مکتبہ اسلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۹۲-۱۹۱

۲ - خط بنام طاہر تونسوی ۱۲۔ دسمبر ۱۹۶۷ء

ملتان کے اردو شعراً - ایک تذکرہ از طاہر تونسوی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۸ء ص ۱۵۰

ملتان میں اردو شاعری، از طاہر تونسوی، الحمرا اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۷۲

ملتان میں اردو شاعری، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۴

پاکستانی اہلِ قلم کی ڈائریکٹری، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۶۶

ہمارے اہلِ قلم، مرتب زاہد حسین انجم، ملک بکڈپو، لاہور، ۱۹۸۸ء ، ص ۳۴۹

عرش صدیقی - شخصیت و فن، از شوذب کاظمی مقالہ برائے ایم اے اردو، زکریا یونیورسٹی، ملتان ۱۹۸۲ء

۳ - اردو کی نعتیہ شاعری، از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حلقہ نیاز و نگار، کراچی ۱۹۹۸ء، ص ۳۲

۴ - پیرزادہ محمد حسین عارف - احوال و آثار، از منظور الحق صدیقی، فینس بکس سپر مارکیٹ، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۵۲ - ۵۱

۵ - مآثرالاجداد از منظور الحق صدیقی ص ۱۳۲

۶ - ایضاً ص ۱۹۲

۷ - ایضاً ص ۱۹۵ - ۱۹۳

۸ - عرش صدیقی کی شخصیت، از عارف عبدالمتین، ماہِ نو ، لاہور، مئی ۱۹۸۴ء

۹ - ملتان میں اردو شاعری، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۱۵۴

۱۰ - ملتان کے چار درویش، از رحیم گل جنگ، لاہور، مارچ ۱۹۸۵ء

۱۱ - عرش صدیقی، از طاہر تونسوی، روزنامہ مشرق، لاہور، ۲۷۔ جولائی ۱۹۸۲ء

۱۲ - سب اچھا کہیں جسے، از اقبال ساغر صدیقی روزنامہ امروز ملتان، ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۶ء

۱۳ - پہاڑوں سے اُترا جوگی : ملتان کا درویش، از لطیف کاشمیری، دائرے، کراچی جنوری فروری ۱۹۹۵ء

۱۴ - عرش صدیقی کی شخصیت، از عارف عبدالمتین، ماہِ نو، لاہور، مئی ۱۹۸۴ء

۱۵ - کہکشاں، از خالد پرویز بزمِ احباب ملتان ۱۹۸۵ء ص ۳۱ - ۲۰

۱۶ - ترسیل، از محمد افسر ساجد مکتبہ عالیہ،لاہور ۱۹۹۰ء ص ۱۱۳

۱۷ - ملاقات، از منظر امکانی، آہنگ، کراچی، ۷۔ اگست ۱۹۸۰ء

۱۸ - انٹرویو طاہر تونسوی روزنامہ مشرق اہور، ۱۰۔جون ۱۹۸۹ء از سرفراز سید

۱۹ - ایضاً روزنامہ جنگ لاہور ۱۵۔ مارچ ۱۹۹۱ء : تنویر ظہور

۲۰ - ایضاً روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳۔ دسمبر ۱۹۹۱ء : ناصر بشیر

۲۱ - ایضاً روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ء : عمران نقوی

۲۲ - ایضاً روزنامہ نوائے وقت، ۱۲۔ جولائی ۱۹۹۲ء : ایوب ندیم

۲۳ - ایضاً روزنامہ نوائے وقت،لاہور، ۳۰۔ اگست ۱۹۹۱ء : منصور آفاق

۲۴ - دلچسپ ملاقاتیں از تنویر ظہور الحمد پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۲۴۸

۲۵ - خطوط بنام طاہر تونسوی

۲۶ - پہاڑوں سے اُترا جوگی - ملتان کا درویش، از لطیف کاشمیری دائرے، کراچی، جنوری فروری ۱۹۹۵ء، ص ۹۲ - ۹۱

۲۷ - خط بنام ڈاکٹر طاہر تونسوی : ۲۰۔ مارچ ۱۹۹۶ء، کراچی

۲۸ - سب اچھا کہیں جسے، از اقبال ساغر صدیقی روزنامہ امروز ملتان، ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۶ء

شعوری محرکات کی شاعری

نظم

عرش صدیقی نے اگرچہ اپنا تخلیقی سفر غزل سے شروع کیا مگر بہت جلد وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے نظم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لئے نظم کو وسیلہ بنایا، تاہم وہ غزل جیسی سدا بہار صنف سے بھی ناطہ جوڑے رہے اور یہ ان کی تخلیقی فعالیت اور ذہنی نشوونما کی دلیلِ روشن ہے۔ عرش صدیقی کی نظمیں ایک الگ اور منفرد انداز کی ہیں اگرچہ انہوں نے عارف عبدالمتین اور صلاح الدین ندیم کے ساتھ اپنا شعری سفر شروع کیا تاہم ان کی شاعری اور خاص طور پر ان کی نظمیں انفرادیت کا پہلو لئے ہوئے ہیں اور وہ ایک الگ راستے کے مسافر دکھائی دیتے ہیں۔ "دیدۂ یعقوب" سے "محبت لفظ تھا میرا" اور "اُسے کہنا دسمبر آگیا ہے" کی تازہ نظموں کے تناظر میں ان کے ہاں ایک مسلسل تخلیقی سفر کی نشاندہی ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عرش صدیقی کا قلم نہ تو کہیں رکا ہے اور نہ کہیں ٹھہرا ہے بلکہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ناقدینِ فن نے ان کی طرف وہ توجہ نہیں کی جو ان کا حق بنتا ہے، پھر بھی جن اہلِ دانش نے ان کی نظموں پر قلم اٹھایا ہے وہ موضوع اور اسلوب دونوں حوالوں سے عرش صدیقی کو خراجِ تحسین پیش کرنے اوران کو سراہنے پر مجبور ہوئے۔ اور بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے شاعروں میں عرش صدیقی کا نام لینے سے گریز کرتے تھے، بلکہ انہیں سراسر نظرانداز کردیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے نوشی گیلانی اور منور جمیل قریشی کے مرتبہ کردہ کلیاتِ ظہور نظر کا فلیپ ا لکھا تو فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی

اور راشد کے ساتھ عرش صدیقی کا نام لیا تو کشور ناہید نے ڈاکٹر سلیم اختر سے احتجاج کیا تھا کہ یہ دیکھیں آپ کا شاگرد کیا حرکتیں کررہا ہے، مجھے ایسے لگا جیسے میں نے کوئی غیر شرعی حرکت کی ہو کہ تین شعراء کے ساتھ ملتان کے عرش صدیقی کا نام لے لیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عرش صدیقی کی بعض نظمیں بنت اور موضوع کے حوالے سے بہت بڑی نظمیں ہیں اور اُنہیں کسی کے ساتھ بھی موازنے کے لئے رکھا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ عرش صدیقی کی نظموں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ یقینی طور پر اہم ترین شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ عرش صدیقی کی نظموں کے تین مجموعے اس وقت تک منظرِعام پر آئے ہیں :

دیدۂ یعقوب	۱۹۶۶ء
محبت لفظ تھا میرا	۱۹۸۳ء
اسے کہنا دسمبر آگیا ہے	۱۹۹۷ء

"دیدۂ یعقوب" میں نظمیں، گیت اور غزلیں شامل ہیں جب کہ "محبت لفظ تھا میرا" میں صرف نظمیں ہیں اسی طرح "اُسے کہنا دسمبر آگیا ہے" میں نئی اور پرانی نظمیں شامل ہیں۔

"دیدۂ یعقوب" میں دعائے نیم شبی، رشتۂ دل، پابہ زنجیر، آدھی رات کا درد، ارتقاء کا ایک تاریک موڑ، آبِ گم کا سفر، سہارے، نارسائی، ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو، روزن، اے جادوگر، میں بھٹکتا ہوں قریب آ، بازگشت، عشق، سہاگن کا گیت، بھتنا، کدھر جائے اولادِ آدم، بیکرانی، تن سنگھ، سایۂ مریم، پیاس، نوح، لیلائے فن کے نام، رات کا گیت، پیکرِ سوزدروں، دیدۂ یعقوب، حدِ گنبدِ شب، سرِشام، تقابل، مرے وحشی جہانِ نو اور سراب متنوع موضوعات لئے ہوئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی[۲] نے فلیپ پر لکھا ہے :

''عرش صدیقی کی شاعری کچھ کھوجتے ہوئے کچھ ڈھونڈتے ہوئے انسان کی شاعری ہے جو اپنی ذات کے حوالے سے اپنے دکھوں اور اپنی محرومیوں کے حوالے سے زندگی کے مختلف مظاہر کو مکمل فن کارانہ زاویے سے پرکھتے ہیں اور یوں اس کی بظاہر انفرادی تاثر والی شاعری ایک ہمہ گیر عصری تاثر بن جاتی ہے ذات کو کائنات میں کھپا دینے کا یہی کمال ہے جس کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ عرش کا مستقبل اردو شاعری کی طرح روشن ہے''۔

احسان دانش[۳] نے عرش صدیقی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عرش شاعری کی بدلتی ہوئی اقدار سے متاثر ہیں موجودہ اقدار کی تبدیلی کے سلسلے میں ایک فکر ایک تقدس اور ایک تحقیقی رجحان شعر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ عرش رجعت پسند نہیں وہ اس حد پر کھڑے سوچ رہے ہیں جہاں سے دونوں معاشروں کے خدوخال نظر آتے ہیں اشعار کی سطح عوام سے بلند ہے کتاب ''دیدۂ یعقوب'' شائع ہوچکی ہے جس میں عرش کے خدوخال دھندلے نہیں''۔

کشفی ملتانی[۴] نے عرش صدیقی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''عرش صدیقی ملتان کے ادیبوں اور شاعروں میں خاص مقام رکھتے ہیں شاعری کی جدید تحریکوں سے متاثر ہیں۔ نظم ان کا اصل میدان ہے''۔

''دیدۂ یعقوب'' کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے اور اس میں انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے عرش صدیقی کی نظموں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے ان کے بقول:

''عرش صدیقی ایک سچا شاعر ہے اور اس کے ہاں نہ صرف خلوص کی فراوانی ہے بلکہ وہ اپنے تاثرات کے اظہار و ابلاغ پر قدرت بھی رکھتا ہے۔ پھر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ عرش کسی خول میں مقید

نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے ایک شدید انسان دوستی کے دباؤ کے تحت ذات کی حدود کو پار کر کے کائنات کی کروٹوں کا احاطہ کیا ہے"۔

یوں تو "دیدۂ یعقوب" کی نظمیں اپنے تفکر، اظہارِ خیال اور نظم کے سانچے کے اعتبار سے منفرد ہیں اور ان میں ایک نیا پن اور گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے۔ تاہم ان کو بار بار پڑھنے سے ان کے معنی کی تہوں تک پہنچنا پڑتا ہے۔ اور اس میں جو دُکھ اور کرب کی پرچھائیاں ہیں اُنہیں محسوس کرنا پڑتا ہے اس کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ عرش صدیقی کے ہاں تجربات مشاہدات اور احساسات کا جو سمندر موجزن ہے اس کی لہروں تک رسائی کے لئے ذہنِ رسا اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہے اور اس کے پس منظر میں محبت کے عظیم تر جذبے کی جو موجیں اُٹھتی ہیں ان کی گرفت میں شاعر کی تخلیقی سطح تک جانا پڑتا ہے اور ان علامتوں اور استعاروں تک پہنچنا پڑتا ہے جن کے تناظر میں یہ نظمیں کہی گئی ہیں چنانچہ ارتقاء کا ایک موڑ، آبِ گم کا سفر، ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو، اے جادوگر، تن سنگھ، دیدۂ یعقوب اور مرے وحشی جہانِ نو انہیں کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ بقول مرزا ادیب[۶]:

> "دیدۂ یعقوب کی علامتی ترکیب اُن کی شاعری کی معنویت پر پوری طرح حاوی ہے۔ یہ ترکیب دو کیفیتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو کچھ کھوچکا ہے اس کے لئے اشک باری اور کچھ پالینے کی جستجو --- موت ان سے جو کچھ چھین چکی ہے دیدۂ عرش اس کے لئے اشک فشاں ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ جستجو کناں بھی ہیں یہ. جستجو کھوئی ہوئی متاعِ حیات کے لئے نہیں۔ وہ جانتے ہیں جو چیز چلی گئی وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ یہ جستجو زندگی کی حقیقت کے لئے ہے اور یہ حقیقت ہاتھ آکر بھی نہیں جاتی"۔

اس مجموعے کی یادگار اور مؤثر کن نظم "دعائے نیم شبی" ہے جو ہر اعتبار سے بے پناہ معنویت لئے ہوئے ہے۔ اس کے پس منظر میں اپنی اولاد خاص طور

پر بیٹی کے لئے جس شدید محبت کا اظہار کیا گیا ہے اور اس کی مستقبل کی زندگی کے لئے جو تمنا کی گئی ہے وہ اپنی جگہ اہم بھی ہے اور زندگی کا خاصا بھی، اور اس متاعِ عزیز کے لئے والد کے جو جذبات و احساسات ہوتے ہیں ان کا بیان شدید جذبہء محبت کے ساتھ ہوا ہے۔ (یہ بات یہاں کہنی بے جا نہ ہوگی کہ عرش صدیقی کی بیٹی منزہ کا جس کے لئے یہ نظم تخلیق ہوئی، بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا)، اُس حوالے سے یہ نظم اور بھی افسردہ کردیتی ہے بلکہ رُلادیتی ہے۔ عارف عبدالمتین[۷] نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ننھی منزہ کی دلآویز تصویر اور دعائے نیم شبی کی موجودگی نے اس مجموعہ کو ابدیت سے ہمکنار کردیا ہے جو اہلِ دل کی آنکھوں سے ہمیشہ آنسوؤں کا خراج لیتا رہے گا"۔

اس سلسلے میں دیدۂ یعقوب پر تبصرہ[۸] کرتے ہوئے مرزا ادیب نے لکھا ہے:

"اس مجموعے کی مؤثر ترین نظم "دعائے نیم شبی" ہے۔ یہ دعا شاعر نے اپنی چھن جانے والی بچی کے لئے مانگی تھی"۔

عرش صدیقی کا مجموعہء کلام دیدۂ یعقوب جن شاعروں اور ادیبوں کے پاس پہنچا انہوں نے ان نظموں کی بڑی تعریف کی۔ چند خطوط سے اقتباس اس کی اہمیت اور افادیت کے لئے کافی ہیں۔

"چند روز ہوئے دیدۂ یعقوب کی ایک جلد ملی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ آج کل میں اسے پڑھ کر لطف اندوز ہورہا ہوں۔ چند نظمیں بے حد پسند آئیں خاص طور پر دعائے نیم شبی، پابہ زنجیر، بازگشت، تن سنگھ، مرے وحشی جہانِ نو، میں بھٹکتا ہوں قریب آ، اور کدھر جائے اولادِ آدم، وغیرہ" (۲۵۔ ستمبر ۱۹۶۶ء)

اقبال منہاس نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا:

''خط، غزل، نخلستان اور دیدۂ یعقوب کے لئے کس منہ سے شکریہ ادا کروں یہ سب چیزیں آپ کی من موہنی شخصیت پر دال ہیں، میں اس کرم کے لئے سر بہ بسر نیاز ہوں۔ غالبؔ کے شکوۂ تنگنائے غزل کی طرح مجھے بھی اپنی کم علمی کا اعتراف ہے۔ اس کے باوجود میں دیدۂ یعقوب سے وابستہ گہری عقیدت کا عملی اظہار کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ دعائے نیم شبی مسلسل کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ الفاظ میرے احساسات کے ترجمان نہیں بن سکتے۔ قلم میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تعریف کے لئے بولنے والی زبان اس عظیم نظم کی عظمت کو نہیں چھو سکتی۔ ننھی منزہ موت کے ظالم ہاتھوں سے ماوراء ہے۔ اس نظم کی تخلیق کے بعد وہ غیر فانی ہوگئی ہے، وہ میرے آنگن میں کھیل رہی ہے --- میں اس کی ننھی ننھی باتیں سن رہا ہوں۔ وہ مجھے ہر گام ملی، ہے بخدا وہ زندہ ہے''۔(۳۔ اپریل ۱۹۶۷ء)

بلراج کومل نے لکھا:

''میں آپ کی نظمیں پڑھتا رہا ہوں اور انہیں پسند بھی کرتا ہوں۔ ان کی تہہ میں پرخلوص جذبات کی جو لہر رواں دواں ہے اس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی نظموں کی قوت اور حسن کا راز ان تفصیلات سے ہے جن سے آپ اپنی تعمیر کرتے ہیں۔ تفصیل کاری ہی دراصل آپ کا طریقہ کار ہے۔ دعائے نیم شبی، ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو، دیدۂ یعقوب، سایۂ مریخ، مرے وحشی جہان نو، مجھے خاص طور پر پسند آئیں۔ دیدۂ یعقوب پر تبصرہ لکھنے کی کوشش کروں گا اور اپنے تاثرات کا تفصیل سے اظہار کروں گا''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دیدۂ یعقوب پر اپنے تبصرے[۹] میں لکھا:

''ہمارے ادب میں دیدۂ یعقوب، پیراہنِ یوسف اور چاہِ کنعاں کی

ترکیبیں زندگی کے جس جمال و جلال، جس نازونیاز اور جس کرب و نشاط کی طرف اشارہ کرتی ہیں زیرِ نظر مجموعہء کلام فی الواقع انہی کا حامل ہے --- ان کی شاعری کا اصل رنگ روپ نظموں میں نکھرتا ہے۔ دیدۂ یعقوب کے عنوان کی نظم اس سلسلے میں خصوصیت سے قابلِ مطالعہ ہے۔ اس میں عرش صدیقی نے حد درجہ دردمند، پرخلوص اور خیال آفریں لب و لہجے میں اپنے تجرباتِ حیات کو ڈھال دیا ہے۔ یہ تجربات بظاہر ایک فرد کے ہیں، لیکن غور کرنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے جز میں کل اور قطرہ میں دجلہ کو دیکھنے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں قارئین سے اس مجموعے کی چند نظمیں مثلاً حدِ گنبدِ شب، مرے وحشی جہانِ نو، سرشام، کدھر جائے اولادِ آدم اور پابہ زنجیر وغیرہ کے مطالعے کی گزارش کروں گا۔ یہ نظمیں نہ صرف یہ کہ شاعر کے مزاجِ خاص کی آئینہ دار ہیں بلکہ زبان و بیان اور صوت و آہنگ کا ایسا جادو جگاتی ہیں جسے عرش صدیقی کے مستقبل کا ضامن کہہ سکتے ہیں"۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے دیدۂ یعقوب پر تبصرہ[۱] کرتے ہوئے اظہارِ خیال کیا ہے:

"دیدۂ یعقوب کا شاعر اپنی ذات کے زنداں میں گرفتار ہے۔ جہاں غم ہیں، دُکھ ہیں، بیٹی کی وفات کا چرکہ ہے، شاعر کے ذہن پر تاریکیاں منڈلا رہی ہیں، رات کی تاریکی اسے آسیب بن کر پریشان کرتی ہے۔ درد و کرب میں مبتلا شاعر اپنی ذات اور خارجی زندگی کے درمیانی فاصلوں کو پاٹنے کے لئے ایک علامت سے مدد لیتا ہے، اور وہ ہے دیدۂ یعقوب!"

دیدۂ یعقوب کی علامتوں، استعاروں، تراکیب اور اظہار و بیان سے ایک طرح کی بے یقینی کی صورتِ حال سامنے آتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ عرش

صدیقی تاریک راہوں کا ایک ایسا مسافر ہے جسے منزل تو کجا منزل تک کا سراغ بھی نہیں ملتا، اور وہ اَن دیکھے جہانوں میں بھٹکتا پھر رہا ہے غم و اندوہ کی یہ فضا بہت سی' نظموں پر چھائی ہوئی ہے اگرچہ خود عرش صدیقی'' نے بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے :

''دیدۂ یعقوب کی بیشتر نظموں میں مایوسی اور بے بسی کی ایک واضح لہر موجود ہے، یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بعض واقعات کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی اور بے بسی نے میرے ذہن پر موت کا خوف سوار کردیا تھا، اور میں زندگی کے بے معنویت اور فرد کی بے بضاعتی کے احساس سے مغلوب تھا''۔

بہرحال کچھ بھی ہو ان نظموں پر افسردگی کی فضا کا غلبہ ہے اور اس میں بھی شعور کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے، اس لئے کہ شعوری طور پر جو کچھ انہوں نے محسوس کیا یا جن تجربات و حوادث کا وہ شکار ہوئے ان کا عکس بھرپور طریق سے ان نظموں میں آگیا ہے، مگر کہیں کہیں وہ اس کیفیت سے نکلے بھی ہیں اور ان کا لب و لہجہ بھی تبدیل ہوا ہے۔ عرش صدیقی کی کئی نظمیں حوالے کی چیزیں ہیں چند نظموں سے اقتباس دیکھئے :

فضا چپ ہے اور نصف شب جاچکی ہے
میں اک فکرِ فردا لئے جاگتا ہوں
مری ننھی بچی منزہ کہ جس کو
ابھی اس کی امی بہت پیار کرتے ہوئے سو گئی ہے
مجھے میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے

(دعائے نیم شبی)☆

☆ یہ نظم اس کتاب میں عرش صدیقی کی نظموں کے انتخاب میں شامل ہے۔

کئی بار اس نے پکارا ہے مجھ کو
کئی بار میں نے بھی آواز دی ہے
مگر میں ہوں اپنی پہاڑی کا قیدی
ادھر دشتِ فردا ادھر کوہِ ماضی
یہ سب دور ہی دور سے دیکھتا ہوں

(پا بہ زنجیر)

مری حیاتِ مختصر
ہے آبِ گم کا اک سفر
مرے سفر کی اک سحر
مرے سفر کی ایک شام
اور اس کے بعد مستقل
زمیں کی گود میں ابد کی تیرگی
پرانے مقبروں کی گہری خامشی

(آبِ گم کا سفر)

دنیا محوِ خوابِ گراں ہے ہر جانب خاموشی ہے
ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو ورنہ تم پچھتاؤ گے

(ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو)

میں سوچتا ہوں کہ اس خرابے سے لوٹ جاؤں
وہیں --- جہاں میں نے زندگی کا سکون ڈھونڈا
مگر نہ پایا
وہیں جہاں میں نے روشنی کے سراب دیکھے

حقیقتوں پر نقاب دیکھے
وہیں جہاں میں نے راحتوں کے حباب دیکھے
وہیں ملے گا سکوں اگر مجھ کو زندگی میں کہیں ملے گا
مگر یہ اک خوف میرا دامن اسی خرابے سے باندھتا ہے
کہ اس جگہ پھر اگر جنوں نے سکوں نہ پایا تو کیا کروں گا!!

(بازگشت)

ہوٹلوں میں رقص گاہوں میں گھروں میں دشت میں
آرزوؤں میں نگاہوں میں دلوں میں ذہن میں
ایک ویرانی مسلط ہے کہ کنعاں میں نہ تھی
حسرتوں کی دھول سے لپٹی ہوئی ہے زندگی
گم ہوا ہے ہر نظر سے اک نہ اک یوسف یہاں
ہر بشر اک دیدۂ یعقوب ہے
لیکن اس کی تیرگی ہے بیکراں
بے کراں
اور بے اماں
اور مستقل !!

(دیدۂ یعقوب)

عرش صدیقی کی ان نظموں کے ٹکڑوں سے اس بات کی گواہی ملتی ہے کہ دیدۂ یعقوب کا شاعر خوفزدہ اور زندگی سے ناامید دکھائی دیتا ہے، اور یہ سب ان حالات کی پیداوار ہے جن سے شاعر مصاف زیست میں گزرا ہے، مگر ایک خاص بات یہ ہے کہ افسردگی اور ناامیدی کے پیرایۂ اظہار کے باوجود ان میں جو تاثریت ہے اور دل میں کھب جانے والی کیفیت ہے وہ نظموں کے اجتماعی تاثر کو

اور بڑھا دیتی ہے، اور میرے نزدیک غم کی کہانی ہی بڑی حقیقت ہے اور ابدیت کی بنا پر ناگزیر سچائی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس حوالے سے یہ نظمیں بڑی بھی ہیں اور سچی بھی ---

"محبت لفظ تھا میرا" کی نظمیں اگرچہ اور ہی اظہار و بیان اور اسلوب و معنیٰ کی نمایندگی کرتی ہیں تاہم مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عرش صدیقی افسردگی، اُداسی اور ناامیدی کی فضا سے باہر نہیں نکل سکے۔ اور جو خوف ان کے دل میں بیٹھ گیا ہے اُسے وہ باہر نہیں نکال سکے البتہ ایک خود اعتمادی کی کیفیت ضرور پیدا ہوئی ہے جو میرے خیال میں محبت، خیر اور حسن کے جذبوں کی دین ہے، اور زندگی کی ان حقیقتوں کا عرش صدیقی نے شعوری طور پر ادراک کیا ہے۔ "محبت لفظ تھا میرا" کی نظمیں بھی جاندار ہیں اور اپنے منفرد اور توانا اسلوب کی وجہ سے الگ شناخت رکھتی ہیں تاہم اس پر عرش صدیقی کا اپنا لکھا ہوا مضمون "کچھ اپنے اور اپنی شاعری کے بارے میں" خاصا توجہ طلب ہے۔ اور اس کتاب کے تبصرہ نگاروں اور اس پر مضمون لکھنے والوں نے بطورِ خاص اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ "محبت لفظ تھا میرا" کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے اور ان کے بارے میں مجموعی تاثر بیان کیا جائے ضروری ہو جاتا ہے کہ ناقدینِ فن کی آراء کو دیکھ لیا جائے۔ مگر اس سے پہلے عرش صدیقی کا تحریر کردہ[۱۲] یہ ابتدائیہ دیکھئے:

> "مجھے یہ خوش فہمی ہے (غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے) کہ "محبت لفظ تھا میرا" میں شامل سب نہیں تو بیشتر نظمیں اردو زبان کے دوسرے شعراء کی نظموں سے مختلف ہیں اور ان نظموں کا لہجہ، اسلوب کا مجموعی تاثر، ان میں منعکس انسانی رویہ اور ایک حد تک موضوعات کا انتخاب مجھے دوسرے شعراءؔ سے ممتاز نہیں تو انفرادی پہچان کے لئے لازمی حد تک مختلف اور الگ ضرور کر دیتا ہے۔ میرے پاس ان نظموں کی اشاعت کا صرف یہی ایک جواز ہے"۔

"میں جس طرح سچے عشق کو اندھا جذبہ نہیں مانتا اسی طرح میں فن کو بھی محض لاشعور یا اندھے جذبوں اور ظالم فاتح جبلتوں کی مجبوراً پیدا ہو جانے والی اولاد نہیں سمجھتا۔ شعر کہنا میری مجبوری صرف ایک حد تک ہوسکتی ہے یہ میری ضرورت ہرگز نہیں ہے --- میں تخلیقِ شعر کے اس نظریے کو مسترد کرتا ہوں جس کے مطابق شاعر پیغمبر ہے، شعر الہام ہے اور مضامین غیب سے نازل ہوتے ہیں --- میرے تمام رویوں کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ آج کا باہوش فن کار اور انسان جذبوں اور جبلتوں کا اسیرِ محض نہیں ہے --- شعور وہ عجیب قوت ہے جو مسلسل ارتقاء پذیر ہے، اور ہر نئی دہائی ہمیں شعور کے تحت نئے کرشموں کی خبر دیتی ہے، اس لئے ہمیں فرد اور قوم دونوں کی زندگی کے ہر شعبے میں شعور کی بالا دستی کو تسلیم کرنا چاہئیے۔ جبلتوں، جذبوں اور شعور کے بارے میں یہ نظریہ میرے فکری ارتقاء اور میرے رویوں کے تعین میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے --- میں نے اپنی بیشتر نظمیں ایک ہی نشست میں کہی ہیں۔ میں نے انہیں مدتوں سوچا ہے۔ میری نظموں کے موضوعات کیا ہیں؟ اس کی فہرست تو میں نے نہیں بنائی لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میں نہ ماضی کا شاعر ہوں جیسے عام رومانی شاعر ہوتے ہیں نہ مستقبل کا جیسے ہمارے بیشتر ترقی پسند شعراُ تھے، نہ ماضی اور مستقبل دونوں کا جیسے اقبال تھے۔ میرے پیشِ نظر عموماً حال کا لمحہ رہا ہے"۔

"محبت لفظ تھا میرا" کے ۱۳ صفحات پر محیط اس تحریر پر سیرِ حاصل گفتگو ہوسکتی ہے اور اس کی روشنی میں نظموں کا تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے تاہم جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس سے قبل ناقدین کے خیالات دیکھتے ہیں:

"عرش صدیقی نے "محبت لفظ تھا میرا" کے آغاز میں خود اپنے متعلق اور اپنی شاعری کے بارے میں اتنی سچائی اور دلیری سے گفتگو

کی ہے کہ کسی اور کے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مگر میرے لئے عرش کی نئی نظمیں پڑھنے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ دورِ حاضر میں بہت کم شعرأ ایسے ہوں گے جنہوں نے اپنے فن اور فکر کے بارے میں اتنے حوصلے اور اتنی خود اعتمادی سے بات کی ہو، اور اُن کا فن بھی اس کڑی کسوٹی پر کھرا اُترا ہو۔ ان نظموں میں عرش صدیقی نے فن کے حوالے سے زندگی گزارنے، زندگی کو بامعنی بنانے بکہ اس کی معنویتوں میں اضافہ کرنے کی ایک ایسی طرح ڈالی ہے جس سے جذبہء محض اور جبلت کی مجبوریوں کے اسیروں اور آشوبِ ذات کے مجردوں کو تو سراسر اختلاف ہوگا، مگر ان عناصر کو صد فی صد اتفاق ہوگا جو شعور و ادراک کو انسان اور انسانیت کی پہچان قرار دیتے ہیں اور جو جانتے ہیں کہ وجدان کی کیفیتوں تک بھی شعور ہی کے راستے رسائی ہوتی ہے۔ اپنی شاعری کے موضوعات کو حقیقت اور صداقت کی آئینہ داری کا منصب عطا کرکے انہیں بیان اور زبان کی جملہ رعنائیوں کے ساتھ نظموں کا روپ بخشنا عرش صدیقی کی خصوصیاتِ فن میں سے ایک منفرد خصوصیت ہے --- عرش صدیقی انسان کی ہمہ گیر اور بھرپور زندگی کا ہمہ گیر اور بھرپور شاعر ہے"۔[۱۳] (احمد ندیم قاسمی)

"عرش صدیقی کے معاملے میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب اس نے قدیم داستانوں کے بنیادی مرکزی تصور کی باز آفرینی کی تو ایک نئی شعری صورتِ واقعہ وجود میں آگئی --- عرش صدیقی نے جب اپنی ذات میں غواصی کرکے ہزاروں برس پرانے سفر کی داستان کو ازسرنو تخلیق کیا تو یہ عالمگیر سچائی اس پر منکشف ہوئی کہ مسافر کی طرح بستی اور بستی والے بھی تغیرات کی زد میں ہیں --- عرش صدیقی نے آج کے معاشرے میں پیدا

ہونے والی ایلی نیشن (ALIENATION) کو قدیم داستانوں کے منظر نامہ میں رکھ کر دیکھا تو اس پر یہ بات منکشف ہوئی کہ غیریت اور اجنبیت رابطے کے ٹوٹنے ہی کا نتیجہ ہے۔ عرش صدیقی کے ہاں یہ انکشاف سوچ بچار کا نہیں بلکہ شعری تجربات کا حاصل ہے۔ عرش صدیقی نے زندہ رہنے والی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ عرش صدیقی کی ڈکشن بہت خوبصورت ہے--- عرش صدیقی کی یہ نظمیں واقعتاً شاعری ہیں اور اسلوب کی تازگی کے علاوہ عمودی اور افقی دونوں سطحوں پر انسان کے شعری باطن کو منکشف کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں"۔[۱۴] (ڈاکٹر وزیر آغا)

"محبت لفظ تھا میرا --- لہجے اسلوب اور فکری پانوراما کے اعتبار سے منفرد، بے مثال اور عہد آفریں نظمیں!"[۱۵] (عارف عبدالمتین)

"اپنے پیش لفظ میں عرش صدیقی نے شاعری کی ان مجبوریوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس نے شاعر کو اس کی ذات میں محصور کردیا ہے اور اس حوالے کی روشنی میں شاعری کے اس منصب کو نمایاں کیا ہے جو اچھی اور قابلِ قدر دیرپا شعری تخلیق کے لئے ضروری ہے۔ شاعر اور شاعری کے بارے میں عرش صدیقی کا جائزہ ایک قابلِ ذکر تنقیدی دستاویز ہے اس پس منظر کے ساتھ اس مجموعے میں شامل نظموں کا پڑھنا ضروری ہے --- ان نظموں کا فکری اور شعری لہجہ ہمارے عہد کو اس اصل پہچان فراہم کرتا ہے"۔[۱۶] (جیلانی کامران)

"میں سمجھتا ہوں" "محبت لفظ تھا میرا" ہمارے موجودہ دَور کا ایک اہم شعری مجموعہ ہے جو ہماری نئی نسل کو کئی نئی فکری جہتوں کی طرف دیکھنے کی نفسیاتی ترغیب دے گا"۔[۱۷] (مرزا ادیب)

''نہ تو ان کی شاعری میں انقلاب کا نعرہ ہے نہ بغاوت کی بُو - وہ سلاست روی سے اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں اور اُن جذبوں کو شعور کے ساتھ آمیز کردیتے ہیں --- میں ان کی نظموں کے بارے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان نظموں سے اردو نظم کی تاریخ میں ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ اُبھرا ہے''۔[۱۸] (ڈاکٹر اے بی اشرف)

''ان نظموں میں قوتِ متخیلہ کو ایک وژن دے دی گئی ہے فلسفیانہ بیانات اور محاکاتِ شعری کو یکسو کردیا گیا ہے۔ زندگی کے حقائق اکثر جذبات کی جراحت کرتے ہیں۔ جذباتی شکست و ریخت کی پیدا کردہ خود آگہی، جذبہء محبت سے کسی صورت بھی متصادم نہیں ہوتی ہے۔ رومان اور حقیقت کے درمیان آویزش عقل کی مداخلت سے اپنے منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔ ''محبت لفظ تھا میرا'' میں ان دو انتہاؤں کے درمیانی بُعد کو ختم کرنے کی سعی کی گئی ہے''۔[۱۹] (محمد افسر ساجد)

''عرش صدیقی وقت کو لازوال سمجھتا ہے وہ خواہشات اور امکانات سے بھرپور محبت کرنے والا شاعر ہے، یہی وجہ ہے کہ وقت کی بیکرانی میں بھی امکانات کی سخت جانی کی وجہ سے وہ وقتی طور پر افسردہ تو ہوسکتا ہے مگر ہمیشہ کے لئے کبھی مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہیں ہوسکتا کہ رجائیت اور روشنی اس کا زادِ سفر بھی ہے اور سرمایہء منزل بھی''۔[۲۰] (جمیل ملک)

''اپنے عہد کے آئیڈم سے ایک ایسا نیا شعری آہنگ تخلیق کرنا جس کی بنا پر اس کا رشتہ قاری سے کٹنے نہ پائے اور انسانی رشتوں کی تہہ داریت، معنویت اور پیچیدگی کا احساس کرنا اور اپنی بات کہنے کے لئے منفرد اور دلکش لہجہ تلاش کرلینا ایک بڑا کارنامہ ہے، اور عرش نے یہ کارنامہ تمام رکاوٹوں کے باوجود سرانجام دیا ہے''۔[۲۱] (فاروق عثمان)

اور اب خطوں سے چند اقتباسات :

"خوبصورت شاعر کی خوبصورت نظمیں جن میں ایک خوبصورت انسان جھانک رہا ہے"۔ (محسن احسان)

"آپ کی منظومات بڑی فکر انگیز ہیں اور آپ کے منفرد لہجے کی خوشبو سے سرشار" تاج سعید (۲۱۔ جنوری ۱۹۸۴ء)

"آپ کی محبت میرا اعزاز ہے۔ برادرم ڈاکٹر طاہر تونسوی نے آپ کی نظموں کی کتاب مجھے دی، میں نہال ہوگیا۔ ساری نظمیں پڑھ ڈالیں۔ آپ کا ابتدائیہ ایک فکر انگیز تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مجموعہ نئے زمانوں کا دروازہ ہوگا - انشاء اللہ !" (ڈاکٹر اجمل نیازی)

اس تناظر میں "محبت لفظ تھا میرا" کی نظموں کا منفرد آہنگ، عرش صدیقی کے اپنے بارے میں لکھے ہوئے شعری انکشاف اور اسلوب و معنی کے اعتبار سے مزین کیفیت ایک نئی اور انفرادی صورتِ حال سے دوچار کرتی ہے اور اس کے پس منظر میں پھیلے ہوئے موضوعات کائنات کی پوری اکائیت کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

محبت لفظ تھا میرا میں کل بیس نظمیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۱ - بحضور سرورِ کائناتؐ

۲ - اُسے کہنا

۳ - اُس نے مجھے کیوں روکنا چاہا

۴ - اپنی مٹی کی خوشبو

۵ - میں بے ادب تھا

۶ - رائگاں آزادیوں کے بے ثمر انچاس سال

۷ - آسیب

۸ - کامیاب سفر کا انعام

۹ - مسافر آخرِ شب کا

۱۰ - پتھر کے اس بت کی کہانی

۱۱ - سرما کا ایک یادگار واقعہ

۱۲ - اندھے بستروں کے دوست

۱۳- آنے والی نسلوں کے لئے ایک یادداشت

۱۴- کہاں رکھیں پاؤں

۱۵ - جب رن پڑا

۱۶- بند کانوں بند آنکھوں اور بند ذہنوں کے لئے ایک نظم

۱۷- ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں

۱۸- مساوی لا

۱۹ - میں کیا کہوں ان سے

۲۰- محبت لفظ تھا میرا

ان نظموں کے عنوانات ہی سے ان کے انفرادی موضوع اور لب و لہجے کا پتہ چل جاتا ہے تاہم ان نظموں میں جو نظمیں اپنی توجہ کھینچتی ہیں ان میں ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۵، ۱۶، ۱۸ اور ۲۰ شامل ہیں اور ان کی تعداد گیارہ بنتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان گیارہ نظموں کے بل بوتے پر عرش صدیقی اردو نظم کے بڑے شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی نظم ''اُسے کہنا'' تو ایک متھ کی شکل اختیار کرگئی ہے اور اردو نظم کا کوئی انتخاب اسے شامل کئے بغیر مکمل نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی نظم کی کوئی تاریخ جامع کہلاسکتی ہے۔ اس حوالے سے عرش صدیقی کو بڑا فن کار بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی نے صحیح تجزیہ کیا ہے کہ[۲۲]:

''محبت ایسے آسمانی موضوع کو نظم کے زمینی ماحول سے ہم آہنگ کرنا

بڑے فن کار کی پہچان اور بڑے فن کی دلیل ہے۔ عرش صدیقی نے اپنی نظموں میں اس موضوع کو کمال مہارت سے پیش کیا ہے"۔

عرش صدیقی کی نظموں کا مطالعہ[٢٣] کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ہی جست میں ان کے معنیٰ کی تہوں تک نہیں پہنچا جاسکتا اور کئی بار پڑھنا پڑتا ہے اس لئے کہ عرش صدیقی نے نہایت محنت اور جانفشانی سے اپنے برسوں کے خیالات کو نظم کیا ہے اور اس کو لمحۂ موجود کی مناسب شکل دینے کے لئے کتنی تبدیلیاں کی ہیں یوں وہ مجھے روما کے شاعر ورجل کی مانند نظر آتے ہیں جو صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر اُن پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا اور یہ بات کہا کرتا تھا کہ ریچھنی اس طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے، مگر اس بات کا عرش صدیقی کی نظموں سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ وہ ان پر غور و فکر کرتے رہتے تھے، اور یوں بھی عرش صدیقی کی نظمیں پہلے ہی خوبصورت ہوتی ہیں اور وہ انہیں خوب سے خوب تر بناتے ہیں۔

عرش صدیقی کی نظمیں متنوع موضوعات لئے ہوئے ہیں اور ان میں تلاش، تجسس اور تحیّر کی ایک عجیب اور سحر آگیں فضا موجود ہے جو محبت اور رومان کے سائے میں پلی بڑھی ہے، مگر ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی محبت اور رومانویت فیضؔ اور راشدؔ کے رومانی رویوں سے قطعی طور پر مختلف ہے اور عرش صدیقی کے اسلوب نے ان رویوں کو اور ہی طرح سے پینٹ کیا ہے۔ اسلوب کی بات آئی ہے تو میں یہ بھی کہتا چلوں کہ عرش صدیقی نظم میں کہانی بیان کرتے ہیں، ڈراما پیدا کرتے ہیں، مکالمے ادا کرتے ہیں، اور پھر المیاتی تاثر تک پہنچا دیتے ہیں، اور وہ یوں کہ محبت اور رومان کی کیف آگیں ندی کے دھیرے دھیرے بہاؤ کے ساتھ قاری بہتا چلا جاتا ہے کہ یکایک نظم کا آخری ٹکڑا اس جمالیاتی طلسم کو توڑ کر رکھ دیتا ہے، اور قاری ایک عجیب و غریب جھٹکا محسوس کرتا ہے جیسے اُسے پہاڑ کی بلند و بالا چوٹی سے بہت نیچے گھاٹی میں پھینک دیا گیا ہو، یوں اس کے خیالات کی رو اچانک نیا رخ اختیار کرلیتی ہے اور مسرتوں کے گلاب کھلنے کی

بجائے یاسیت کی فضا چھا جاتی ہے اور یوں نظم کی رجائیت افسردگی میں بدل جاتی ہے۔ "محبت لفظ تھا میرا" اور "مساوی لا" ایسی ہی افسردگی کو جنم دیتے ہیں۔ عرش صدیقی کو اپنی ذات سے محبت ہے، مگر وہ اس محبت کو اپنی ذات کا آشوب نہیں بننے دیتے، اور نہ ہی اس محبت کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لئے وہ خود اپنے آپ کو بھی راہ کی دیوار نہیں بننے دیتے۔ "رائیگاں آزادیوں کے بے ثمر انچاس سال" اس کی عمدہ مثال ہے۔

میں کہ اب بھی خواہشوں کے لمسِ بے اندام سے سرشار ہوں
تیری ہمراہی میں ہوں
میں نے اب تک کیسے کیسے نام دے کر تجھ کو دیکھا ہے
خود اپنے رنگ میں
چاہتا ہوں اب بھی تجھ کو پکاروں تیرے اپنے نام سے
اس لئے میں ہر نئے امکاں کی سرحد تک چلوں گا تیرے ساتھ
راہ کی دیوار کیوں میرے لئے ہوں رائیگاں آزادیوں کے
بے ثمر انچاس سال!

عرش صدیقی کی نظموں میں سفر کا استعارہ ایک طرف زندگی کی گہما گہمی اور تحرک کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے تو دوسری طرف انسانی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ انسانی زندگی کے المیے اور انسان کے باطنی کرب کا شدید تریں احساس بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ زندگی میں حسن اور اس سے پیدا شدہ کیفیات میں سچائی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خارج اور داخل کے حوالے سے حسن اور سچائی کی پہچان ان کے لئے "مساوی لا" کی شکل میں ابھرتی ہے تو وہ ڈرتے ڈرتے اور سہمے سہمے انداز میں یہ حقیقت آشکار کرتے ہیں:

میں لب کھولے ترستے ہاتھ پھیلاتے
گلی کوچوں میں مکتب سے نکلتے تازہ بچوں کو

درختوں کی مہک میں روک کر اک بات کہنے کو تڑپتا ہوں
میں کہنا چاہتا ہوں اُن سے دیکھو حسن سچائی ہے اور
سچائی دولت ہے
مگر ڈرتا ہوں کچھ کہتے ہوئے کہ حسن اس دنیا کی ہر شے سے
زیادہ کم ثبات و کم نماشے ہے

نظم ''مَیں بے ادب تھا'' کی یہ چند لائنیں دیکھیئے:

بہت ہی بے ادب تھا مَیں
کہ مَیں بچوں کے سوتے ہی
اٹھا اور اس کے تمغے کو
گلی سے دُور بیٹھے اجنبی کے ہاتھ بیچ آیا
کہ اس شب گھر میں گیہوں تھے نہ چاول تھے!

اسی طرح نظم ''اپنی مٹی کی خوشبو'' کا آخری ٹکڑا دیکھئے:

پھر ایک شب اس کے پہلو سے میں اٹھا اور افق میں
ڈوبتی راہوں پہ چلتا، اپنے آباء کی اُسی مٹی کی خوشبو کے تعاقب میں
چلا آیا جو میرے خوں میں
پلتی تھی!
مجھے پہلو سے گم پا کر وہ سادہ بے زباں لڑکی مگر کیا سوچتی ہوگی!!

غالباً اسی لئے ڈاکٹر سلیم اختر[۲۴] نے لکھا ہے کہ:

عرش صدیقی نے علامات کے لئے اساطیر کا خزانہ کھنگال کر اُنہیں اپنے عصر کی تفہیم کے لئے کامیابی سے برتا۔ ویسے ان کے ہاں اظہار کے لئے صرف علامات ہی پر انحصار نہیں کیا جاتا۔ طویل نظموں میں

ان کا فن خوب نکھرتا ہے"۔

"اُسے کہنا دسمبر آگیا ہے" عرش صدیقی کی نئی اور پرانی نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں دیدۂ یعقوب سے دعائے نیم شبی - رشتہء دل - پابہ زنجیر - آدھی رات کا درد - ارتقاء کا ایک تاریک موڑ - آبِ گم کا سفر - نارسائی - ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو - اے جادوگر - میں بھٹکتا ہوں قریب آ - بازگشت - سہاگن کا گیت - کدھر جائے اولادِ آدم - بیکرانی - سایہ مریخ - پیاس - رات کا گیت - دیدۂ یعقوب - حدِ گنبدِ شب - سرِ شام اور سراب --- محبت لفظ تھا میرا سے بحضور سرورِ کائنات - اسے کہنا - اس نے مجھے کیوں روکنا چاہا - اپنی مٹی کی خوشبو - میں بے ادب تھا - رائیگاں آزادیوں کے بے ثمر انچاس سال - آسیب - کامیاب سفر کا انعام - مسافر آخرِ شب کا - پتھر کے اس بت کی کہانی - سرما کا ایک یادگار واقعہ - اندھے بستروں کے دوست - آنے والی نسلوں کے لئے ایک یادداشت - کہاں رکھیں پاؤں - جب رن پڑا - بند کانوں بند آنکھوں اور بند ذہنوں کے لئے ایک نظم - ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں - مساوی لا - میں کیا کہوں ان سے - اور محبت لفظ تھا میرا --- نئی نظموں میں بظاہر جی رہے ہم - جبر کیا اختیار کیا ہے - پت جھڑ میرا استقبال - میری روشنی لوٹا دے - خواب نما خواب - معما - دیکھتا کوئی نہیں اور وہ نہیں ملا۔

ان نئی نظموں میں موضوع اگرچہ عصر کی تفہیم کررہا ہے تاہم عرش صدیقی کا لب و لہجہ نہیں بدلا اور وہ افسردگی جو شروع سے ان کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی یہاں بھی ان کے ساتھ ہے۔ نظم "بظاہر جی رہے ہیں ہم" کی آخری لائنیں دیکھئے:

"عذاب اتنے ہیں مٹھی بند آنکھوں میں کہ خوابوں کے لئے
گوشہ نہیں باقی
سوال اتنے ہیں ہونٹوں پر کہ سانسوں کے لئے رستہ نہیں باقی

کہاں ہے وہ وفا، وہ حوصلہ جو سر کو گھٹنوں سے اٹھا کر آسماں کا
ہم نشیں کر دے
ہمیں بھی زندگی کی وسعتوں میں جاگتے لمحوں کی لذت کا امیں کر دے !!"

نظم "جبر کیا ختیار کیا ہے" کی یہ کیفیت دیکھئے ؟

کبھی یہ محدود حالتوں کے حصار ٹوٹیں تو جان پائیں
کہ جبر کیا اختیار کیا ہے !
کہ بے کراں زندگی میں جینے کی آرزو کا مدار کیا ہے
ابھی تو بس اس قدر کھلا ہے کہ اس سفر میں
قدم جو اُٹھے نہیں ہیں اب تک فقط وہی اختیار میں ہیں !

غرض عرش صدیقی کی نظم شعوری محرکات کی ایسی شاعری ہے جو کائنات کے وسیع تر پس منظر میں گھومتی ہے اور ان نظموں میں کہیں گھر آنگن --- کہیں جنسی رویوں کا ہلکا سا اظہار ہے تو کہیں ذات کا رزم نامہ --- یوں یہ سب نظمیں جہاں جلال و جمال کی کیفیت رکھتی ہیں وہاں عصری صداقتوں کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ جن میں نئی تراکیب بھی تراشی ہوئی ملتی ہیں اور پرانے لفظوں کو نئی تفہیمات کے ساتھ برتا گیا ہے جن کی بدولت ان کی معنویت اور تاثریت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ میرے نزدیک[۲۵] عرش صدیقی اردو شاعری کا وہ فرہاد ہے جس کے ہاتھ میں تیشہء لفظ ہے اور جس سے وہ اپنے تجربات، مشاہدت اور محسوسات کے نقش تراش رہا ہے۔ اور جو نقش نظموں کی ہیئت میں لحہء موجود تک سامنے آئے ہیں ان کے پس منظر میں عرش صدیقی کی نظمیں تنوع، تحیر، بحر اور اسلوب و معنی کے اعتبار سے نہ صرف انفرادیت کی حامل ہیں بلکہ اُردو نظم کو ایک تازہ اور شگفتہ پیرایہء بیان سے روشناس کراکر ایک نیا باب شاعری کھولتی ہیں۔ عرش صدیقی کی نظم "دعائے نیم شبی" اور "اُسے کہنا" شاعر کی آرزوؤں اور تمناؤں و خواہشوں کی کہانی بیان کرتی ہیں، جن میں ماضی حال

اور مستقبل کے حوالے سے زندگی اور محبت کے جذبے کو اُجاگر کیا گیا ہے۔
دیکھئے :

اُسے کہنا دسمبر آگیا ہے
دسمبر کے گذرتے ہی برس اک اور ماضی کی گپھا میں ڈوب جائے گا
اُسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں، نہ جاگے گا
اُسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کہرے کی دیواروں میں لرزاں ہے
اُسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں
اور ان پر برف کی چادر بچھی ہے
اُسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی --- اُسے کہنا کہ لوٹ آئے !!

......☆......

حوالہ جات

۱ - ادبی مراکز سے دور ادب کا ارتقاء اور مسائل - مذاکرہ، جنگ لاہور ۳۰۔ مئی ۱۹۹۵ء

۲ - فلیپ دیدۂ یعقوب از احمد ندیم قاسمی

۳ - جہانِ دانش از احسان دانش بحوالہ ملتان میں اردو شاعری، ص ۱۵۵

۴ - ہفت روزہ بشارت، مظفر گڑھ، ۱۰۔ اگست ۱۹۶۵ء

۵ - دیدۂ یعقوب از عرش صدیقی ص ۹

۶ - تبصرہ دیدۂ یعقوب از مرزا ادیب سہ ماہی اردو کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء

۷- عرش صدیقی کی شخصیت از عارف عبدالمتین ماہ نو مئی ۱۹۸۴ء

۸ - تبصرہ دیدۂ یعقوب از مرزا ادیب سہ ماہی اردو کراچی اکتوبر ۱۹۶۶ء

۹ - تبصرہ دیدۂ یعقوب از داکٹر فرمان فتح پوری، نگار کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء

۱۰ - تبصرہ دیدۂ یعقوب از ڈاکٹر وحید قریشی، ریڈیو پاکستان، لاہور ۱۹۶۷ء

۱۱ - تکوین از عرش صدیقی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۰

۱۲ - محبت لفظ تھا میرا از عرش صدیقی ص ۱۱ تا ۲۳

۱۳ - فلیپ محبت لفظ تھا میرا از احمد ندیم قاسمی

۱۴ - دائرے اور لکیریں از ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ فکروخیال لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۹۵ - ۹۴

۱۵ - فلیپ محبت لفظ تھا میرا از عارف عبدالمتین

۱۶ - فلیپ محبت لفظ تھا میرا از جیلانی کامران

۱۷ - زہرناک حقیقتوں کا شاعر از مرزا ادیب ، نوائے وقت، لاہور ۸۔ مئی ۱۹۸۴ء

۱۸ - عرش صدیقی کی نظمیں- ایک تجزیاتی مطالعہ از ڈاکٹر اے بی اشرف، فنون لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء

۱۹ - ترسیل، از محمد افسر ساجد، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۳۲ - ۳۰

۲۰ - عرش صدیقی - حرف محبت کا شاعر از جمیل ملک، دائرے، کراچی جنوری فروری ۱۹۹۵ء

۲۱ - شاعر از فاروق عثمان، مشمولہ محبت لفظ تھا میرا، ص ۱۰۳ - ۹۳

۲۲ - ادب آثار از ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی، کاروانِ ادب ملتان ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۱

۲۳ - کچھ عرش صدیقی کے فن اور شخصیت کے بارے میں، از ڈاکٹر طاہر تونسوی

محبتوں، چاہتوں اور صحت مند ادبی نظریوں کا شجرِ سایہ دار از ڈاکٹر طاہر تونسوی، امروز ملتان ۱۹۸۸ء

ہم سخن فہم ہیں از داکٹر طاہر تونسوی، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۱۱۳ - ۱۰۷

لمحہء موجود - ادب اور ادیب از ڈاکٹر طاہر تونسوی، مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۲ء ص ۱۰۵ - ۱۰۴

ملتان میں اردو شاعری، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۴ء ص ۱۵۶

فلیپ، محبت لفظ تھا میرا، از طاہر تونسوی

عذابِ گویائی کے سلگاؤ کا شاعر، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ماہِ نو مئی ۱۹۸۴ء

۲۴ - اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، از ڈاکٹر سلیم اختر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۱ء، ص ۳۴۳

۲۵ - ہم سخن فہم ہیں، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۴ - ۱۱۳

محبت اور ہوا کا نوحہ

غزل

جیسا کہ تذکرہ ہوا عرش صدیقی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل سے کیا اور منظور الحق صدیقی نے مآثر الاجداد میں ان کے ابتدائی دور کی غزلیں بھی دی ہیں، اور ان کے شعری مجموعے دیدۂ یعقوب میں بھی غزلیں شامل ہیں اور ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "ہر موجِ ہوا تیز" کے نام سے چھپا اور نظمیں کہنے کے ساتھ ساتھ وہ غزلیں بھی کہتے رہے اور غزل کی بعض وجوہات کی بنا پر مخالفت کرتے رہے۔ ان کے بقول[1]:

> "ہماری شاعری خاص طور پر غزلیہ شاعری میں مالیخولیا کے کردار کی حامل بے بسی کا نیم رومانی رویہ بہت مقبول رہا ہے۔ اس رویے میں وہ کشش ہے جو مظلوم میں ہوسکتی ہے۔ ہمارے ہاں فن کار اکثر خود کو اذیت دے کر خود رحمی کا شکار ہوتا ہے اور دوسروں کی توجہ کا مرکز بننے کی بزدلانہ کوشش کرتا ہے"۔

اسی طرح انہوں نے عذرا وحید کی غزلوں کے مجموعے "سراب کا پھول" کا جو دیباچہ لکھا ہے اس میں بھی غزل میں پست درجے کی معاملہ بندی پر کڑی تنقید کی ہے، تاہم اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی غزل کے حوالے سے کہیں بھی اپنے نظریات سے نہیں ٹکرائے اور کسی مقام پر بھی تضاد کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ ان کی غزل کا مطالعہ[2] بتاتا ہے کہ وہ نہ تو سستی قسم کی جذباتیت اور روایتی قسم کی رومانیت کا شکار ہوئے ہیں اور نہ ہی بھری محفل میں تاڑ بازی کا شغل اختیار کیا ہے، بلکہ محبت کے ارفع ترین جذبے اور عشق کے افضل ترین کام کو عبادت سمجھا ہے۔ اسی طرح نہ تو خود اذیتی اور خود رحمی کا اپنے آپ کو اسیر کیا ہے اور

نہ ہی محبوب کے چونچلوں کی خاطر اپنی انانیت کو مجروح کیا ہے۔ دیدۂ یعقوب کی غزلوں میں ان کا یہی رویہ نظر آتا ہے:

میں ساتھ لئے پھرتا ہوں سامانِ ہلاکت
رگ رگ میں مری زہرِ وفا دوڑ رہا ہے

تابندہ حسنِ زارِ بہاراں ہمیں سے ہے
نظمِ خزاں جو ہے تو ہراساں ہمیں سے ہے

درد کو ہم زندگی کا کیف و کم کہتے رہے
خامشی کے ساز پر رودادِ غم کہتے رہے

روشنی بن کے ستاروں میں رواں رہتے ہیں
جسمِ افلاک میں ہم صورتِ جاں رہتے ہیں

بقول مرزا ادیب:

"ان کی غزلوں میں ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں جو غزل کا اچھا خاصا صاف ستھرا نمونہ پیش کرتے ہیں"۔[۳]

وزیری پانی پتی نے "عرش صدیقی کی غزل گوئی"[۴] کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں ان کی غزل کے موضوعات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ:

"عرش کی غزل روایتی غزل ہے، لیکن ان کے عناصر تغزل محض روایتی نہیں بلکہ حقیقی ہیں -- مجموعی طور پر عرش کے کلام میں بڑی توانائی موجود ہے۔ جمالیاتی فکر اور مسائلِ حیات و کائنات سے دلچسپی نے ان کے کلام میں گہرائی اور اثر آفرینی کی خصوصیات پیدا کردی ہیں اور شعروادب کے قدردان ان کے شاندار ادبی مستقبل رکھنے میں حق بجانب ہیں"۔

عرش صدیقی کی جو غزلیں "ہر موج ہوا تیز" میں شامل ہیں ان میں

جمالیاتی کیفیات کا بھرپور عکس ملتا ہے، اور یہاں بھی شعوری رَو پوری طرح موجزن ہے۔ وہ محبتوں کے خزانے لٹانے کے باوجود بھی احترامِ آدمیت کے قائل ہیں اور یوں وہ عاشق اور محبوب میں ایک فاصلہ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں توازن کی کیفیت پیدا ہوئی ہے، جس سے ان کی غزل میں شادابی، خوشگواریت اور تاثریت کی ایک ایسی فضا موجود ہے جو غزل کی ایک نئی روایت کو جنم دیتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے فلیپ[5] پر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

"۵۱ غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہء کلام "ہر موجِ ہوا تیز" عرش صدیقی کے تخلیقی سفر کی باطنی روداد قرار پاتا ہے:

ہر موجِ ہوا تیز فضا تابہ اُفق تنگ
دل ذرۂ صحرا ہے بگولوں میں گھرا ہے

عرش صدیقی کی غزلوں میں جذبہ کا وہی رس ملتا ہے جو غزل کے پیکر میں دل بن کر دھڑکتا ہے:

دل پر رقم تھی ایک سے اک طرفہ داستاں
کوئی بھی زخم عرش دبستاں سے کم نہ تھا

یوں دیکھیں تو عرش صدیقی کسی حد تک میر تقی میرؔ کی دنیائے تخلیق کے آس پاس نظر آتا ہے جس نے --- درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا!

عرش صدیقی زخم آشنا اور درد روشناس ہے کہ بقول اس کے:

چھولیا تھا درد کی زنجیر کو
وہ بھی اب شامل مرے گہنے میں ہے

شاید اسی لیے اس کی غزل میں درد، عنوانِ زیست نظر آتا ہے۔ یہ درد فرد کا بھی ہے اور معاشرہ کا بھی، یہ درد ذات کا بھی ہے اور

عصر کا بھی --- الغرض عرش صدیقی کے لئے درد، انسان، معاشرہ اور زندگی سے وابستہ متنوع امکانات کی تفہیم کا ایک انداز ہے جسے وہ تخلیقی ابلاغ کی سطح پر لا کر عصری شعور کے آئینہ میں تبدیل کردیتا ہے۔ "ہر موجِ ہوا تیز" عرش صدیقی کی سائیکی کے لینڈ سکیپ کا تخلیقی منظرنامہ ہے اس لئے اسے عرش کی ذات کی تفہیم کے لئے ایک استعارہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یوں یہ کتاب محض اشعار کے مجموعہ کی عمومی سطح سے بلند ہوکر تلاشِ ذات کے سفرنامہ کا ایک انداز بھی قرار پاتی ہے"۔

یوں دیکھیں تو واقعی عرش صدیقی کی غزل، سفر کے استعارہ کے طور پر بھی آتی ہے اور اس کی ذات کا منظر نامہ بھی تشکیل دیتی ہے اور اس میں بھی اس کی انفرادیت قائم ہے۔

بس یونہی تنہا رہوں گا اس سفر میں عمر بھر
جس طرف کوئی نہیں جاتا اُدھر جاتا ہوں میں

عرش صدیقی نظم کی طرح غزل میں بھی تنہا مسافر ہے اور غزل کے اس راستے پر چلا ہے جو سب سے الگ تھلگ ہے، چنانچہ وہ نہ تو معاملہ بندی کی دلدل میں پھنسا ہے (اور یہ اُس کے فنی نظریئے کے بھی خلاف ہے) اور نہ ہی فراق زدگی کے حامل شعراء کی طرح جنسی لذت کا قائل ہے بلکہ وہ تو عشق و محبت سے روحانی آسودگی حاصل کرنا چاہتا ہے اور حسن، خیر اور صداقت کی تلاش اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہ محبت حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر نہیں لگاتا، بلکہ محبوب کے ساتھ معمولات و معاملات میں ایک حد تک جاتا ہے، اس لئے میرے[۶] نزدیک اس کی غزل کا فکری نظام حیات و کائنات کی تمام تر اقدار، کیفیات، واقعات و حادثات اور ہر لحظہ کی مبدلات کے گرد گھومتا ہے اور یوں وہ زندگی کا شاعر ہے، اور وہ دنیا سے کنارہ کشی نہیں کرتا اور نہ ہی اس نے خلا میں مکانات تعمیر کئے ہیں۔ وہ انسان کے حوالے سے زمینی رشتوں کا قائل ہے۔ البتہ وہ

ذہنی پرواز ضرور کرتا ہے اور انسان کو آئینہ دکھاتا ہے۔ گوتم بدھ کی طرح دنیا اُسے بھی آلام کا گھر دکھائی دیتی ہے مگر وہ دنیا کو تج نہیں دیتا بلکہ کرب و غم کی ساری کیفیات کو جھیل کرنئے حوصلے اور نئے عزم کے ساتھ نئی دنیا تشکیل دیتا ہے۔

زندگی، ہونے کا دُکھ سہنے میں ہے
زور دریا کا فقط بہنے میں ہے

رک گئے تو دیکھنے آئیں گے لوگ
عافیت اب گھومتے رہنے میں ہے

عرشؔ میں خود ہوں سدا اپنے سکوں کا دشمن
دشتِ امید بھی بر دوشِ ہوا رکھتا ہوں

عرش صدیقی کے ہاں بعض استعارے بھرپور معنویت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی لئے محمد افسر ساجدؔ نے "ہر موجِ ہوا تیز" کو "ہوا کا نوحہ" قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ہوا کے استعارہ کو عرش صدیقی نے بڑے تواتر کے ساتھ استعمال کیا ہے ان کے ہاں ہوا تسلسل، توارد، تغافل، تناسخ، توازن، تموج اور تحیّر کی علامت ہے جس کے مفہوم میں تجرید اور تجسیم دونوں شامل ہیں۔ صوتی اعتبار سے اس مجموعہ میں ہوا کی تکرار سے ایک مغموم فضا پیدا ہوگئی ہے جوان کی شاعری کے مجموعی تاثر سے کہیں کہیں متصادم نظر آتی ہے۔ عرش صدیقی کی "ہر موجِ ہوا تیز" ایک تفسیرِ غم ہے یا ایک نفسِ عرضِ تمنا! وہ جنوں بھی کرتے ہیں تو بڑے شعور سے :

پھیلا نہ مجھے وسعتِ آفاق میں رُک جا
اے تند ہوا میں غمِ ہستی کی گھٹا ہوں"

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عرش صدیقی کے ہاں اظہارِ غم اور درد کی لے دھیمے سروں میں آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں :

عرش لہجے میں ہو گر درد کی خوشبو شامل
لمس الفاظ کا ہو جاتا ہے کلیوں جیسا

عرش صدیقی کی غزل میں اگرچہ شوخ رنگ زیادہ نہیں تاہم اس کے ہاں موضوعات کی جو توانائی ہے اس میں اس کی ذات کا حوالہ ہر جگہ موجود ہے اسی طرح شعوری رو کا توانا احساس بھی لب و لہجے میں تمکنت کے ساتھ شادابیٔ بیان میں معاونت کرتا ہے اور کہیں پر بھی تضاد کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی :

ہاں سمندر میں اُتر لیکن اُبھرنے کی بھی سوچ
ڈوبنے سے پہلے گہرائی کا اندازہ لگا

ہر طرف سے آئے گا تیری صداؤں کا جواب
چُپ کے جنگل سے نکل اور ایک آوازہ لگا

ملتا نہیں بازار سے پیراہنِ یوسف
یعقوب ہوں تاریکیٔ کنعاں میں پڑا ہوں

آنکھوں پہ ہے اک منظرِ کم دیدہ کا پردہ
میں کب سے تری یاد کے زنداں میں پڑا ہوں

ہم نے لفظوں میں نہیں بہنے دیا سیلِ الم
کون رکھ سکتا ہے یوں دل میں سمندر باندھ کر

وہ عیادت کو تو آیا تھا مگر جاتے ہوئے
اپنی تصویریں بھی کمرے سے اُٹھا کر لے گیا

ان مثالوں سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عرش صدیقی کا ہاں عہدِ موجود کی ساری صورتِ حال بول رہی ہے۔ وہ انسان کی بے بسی، محرومی، تنہائی اور آشوبِ ذات کی اسیری پر کڑھتا ہے۔ وہ انسانیت کی تذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ انسانی اقدار کی بازیافت چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ شعور و آگہی کے وسیلے سے

آدمی کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور کہیں پر بھی اپنی انا کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔

حیات مانگ کے لی تھی نہ موت مانگیں گے
نہیں طریق ہمارا کہ ہاتھ پھیلائیں

یہ دل کہ مدفنِ صد آرزو ہے برسوں سے
کہو وہ بات کہ مدفن پہ پھول اُگ آئیں

عمر بھر سر پہ رہا سنگِ ملامت کا عذاب
سوئے افلاک مگر ہاتھ نہ پھیلائے کبھی

اس طرح کے بے شمار اشعار عرش صدیقی کی غزلوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور عصرِ حاضر کے مسائل کا بیان ان کی خصوصیت ہے۔ ''ہر موجِ ہوا تیز'' ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آیا تھا تاہم عرش صدیقی نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا اور وہ نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہتے رہے اور اسے توانائی بخشتے رہے۔ ۲۰۔جون ۱۹۸۸ء کے ایک خط میں انہوں نے مجھے دو غزلیں بھی لکھ بھیجیں جن میں ان کا تخلیقی تنوع برقرار ہے۔

بندھا ہے عہدِ جنوں چشمِ اعتبار کے ساتھ
اُسے کہو کہ جئے عزمِ اُستوار کے ساتھ

نہ ہو سکی کبھی توفیق درگزر کی اُسے
نہ چل سکے کبھی ہم خود بھی اِقتدار کے ساتھ

فقیہِ شہر سے کہنا کہ دل کشادہ رکھے
ملا ہے منصبِ اعلیٰ جو اختیار کے ساتھ

نشانِ ناقہء لیلیٰ پہنچ سے دُور نہیں
کبھی چلو تو سہی دو قدم غبار کے ساتھ

تمام عمر رہا وہ رہینِ منتِ غیر
اُسے تو مرنا بھی آیا نہیں وقار کے ساتھ

ازل سے عرشؔ اک آوارگی نصیب میں ہے
ہوائے دشت کو نسبت نہیں قرار کے ساتھ

انتہا کی کہتے ہو ابتدا میں رہتے ہو
کس فضا میں جیتے ہو کس ہوا میں رہتے ہو

سامنے رکھو ہر دم فاصلوں کی پہنائی
کہکشاں سے اُترے ہو نقشِ پا میں رہتے ہو

بس کہ خبط ہے دعویٰ آسماں نشینی کا
لَوٹ کیوں نہیں آتے کیوں خلا میں رہتے ہو

محتسب نے کل مجھ کو کیا غضب کا خط بھیجا
ہم سے مت گِلہ کرنا کربلا میں رہتے ہو

عرشؔ چھوڑ دو سودا بیکراں محبت کا
ہر کسی پہ مرتے ہو ابتلا میں رہتے ہو

اس لب و لہجے کی غزلیں بہت کم پڑھنے میں آئی ہیں اور عرش صدیقی نے غزل کو بھی ہر اعتبار سے وقار بخشا ہے وہ خود کہتے ہیں:

عرشؔ اگر لفظ و معانی کے ہو تم پیغمبر
ایک تصویر بنا جاؤ کہ دنیا دیکھے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عرش صدیقی نے لفظ و معنی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ جس کی داد دنیا دے رہی ہے۔ اس حوالے سے عرش صدیقی لفظ و معنی کا وہ پیغمبر ہے جس نے غزل کہہ کر پوری ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور اس کی غزل شعورِ ذات کا ایسا منظر نامہ پیش کرتی ہے جس میں سارے جہان

کی سیر بہ اندازِ دگر کی جاسکتی ہے اور پھر یہ بھی کہ اس سے اردو غزل اس دلدل سے بھی نکل آتی ہے جس میں وہ برسوں سے پھنسی ہوئی ہے۔ دیکھئے عرش صدیقی نے غزل میں عہد کی کہانی کس طرح بیان کی ہے:

وہ جس کی داستاں پھیلی دلِ دیوانہ میرا تھا
زبانیں دشمنوں کی تھیں مگر افسانہ میرا تھا

بلا کی خامشی طاری تھی ہر سو تیری ہیبت سے
سرِ محفل جو گونجا نعرۂ مستانہ میرا تھا

کٹے یوں تو ہزاروں سر وفا کی کربلاؤں میں
ترے نیزے پہ جو اُبھرا سر شاہانہ میرا تھا

فقیہِ شہر سے پوچھو کہ ہم پکڑے گئے ناحق
شرابیں سب اُسی کی تھیں بس اک پیمانہ میرا تھا

حوالہ جات

۱ - ''محبت لفظ تھا میرا'' از عرش صدیقی ص ۱۵
۲ - ''ہم سخن فہم ہیں'' از ڈاکٹر طاہر تونسوی یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۹
۳ - تبصرہ ''دیدۂ یعقوب'' از مرزا ادیب رسالہ اردو کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء
۴ - ''مشاہدے'' از وزیری پانی پتی، ادبی معیار پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۲ء، ص ۷۰ - ۶۵
۵ - فلیپ ''ہر موجِ ہوا تیز'' از ڈاکٹر سلیم اختر
۶ - ''ہم سخن فہم ہیں'' از ڈاکٹر طاہر تونسوی، یونیورسل بکس، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۳ - ۱۲۰
۷ - ''ترسیل'' از محمد افسر ساجد، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۶ - ۳۴
۸ - خط بنام ڈاکٹر طاہر تونسوی، ۲۰۔ جون ۱۹۸۸ء

زندہ لمحوں کا کہانی کار

افسانہ

عرش صدیقی نے اگرچہ اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز شاعری اور خاص طور پر غزل سے کیا اور پھر وہ نظم کی طرف راغب ہوئے تاہم انہوں نے کہانی لکھنا بھی شروع کی اور ان کی کہانیاں ادبی رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ منظور الحق صدیقی نے لکھا ہے[۱]:

> ''رسالہ دستور میں آپ کا افسانہ ''اونچا روزگار'' شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ ''صحرا'' بھی آپ کا افسانہ ہے۔ چیخوف کا ترجمہ ''باپ'' قندیل میں شائع ہوا ترزنیف کا ترجمہ ''سرخ پھول'' بھی شائع ہو چکا ہے''۔

ڈاکٹر عرش صدیقی نے آغاز میں جو کہانیاں لکھی ہیں وہ حقیقت نگاری کی روایت کے گرد گھومتی ہیں اور انہوں نے رومانی پس منظر میں یہ کہانیاں تخلیق کی ہیں اور سماجی اور معاشرتی تناظر میں ان کے موضوعات تلاش کئے، چنانچہ یہ کہانیاں مقبول بھی ہوئیں اور انہیں پڑھا بھی گیا۔ بعد میں انہوں نے علامتی کہانیاں تحریر کرنا شروع کیں مگر ان میں کہانی کو برقرار رکھا اور علامت اور استعارے سے کہانی کے موضوع کو آگے بڑھانے یا اپنی بات ڈھکے چھپے الفاظ میں کہنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ عرش صدیقی کی کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا ''باہر کفن سے پاؤں'' جس پر آدم جی ایوارڈ ملا اور دوسرا ''عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے'' جسے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مرتب کیا۔ (اس کتاب کی بھی ایک الگ کہانی ہے جو اس کتاب پر بات کرتے ہوئے بیان ہوگی)۔

جس طرح عرش صدیقی اپنی نظموں کے بارے میں اعتماد سے کہتے تھے کہ ان کی بیش تر نظمیں دوسرے شاعروں سے ہٹ کر ہیں اور ایسی نظمیں کم لکھی گئیں ہیں

اسی طرح وہ اپنے افسانوں کے بارے میں بھی یہی یقین رکھتے تھے کہ ان جیسے افسانے بہت کم لکھے گئے ہیں اور ان کا مجموعہ "باہر کفن سے پاؤں" عہد ساز اور کہانی کو زندہ رکھنے والا مجموعہ ہے اور میرے نزدیک اس میں فن کارانہ تعلّی والی بات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانے موضوع اور اسلوب دونوں حوالوں سے انفرادیت کے حامل ہیں اور اردو افسانے کو ایک نئی توانائی عطا کرتے ہیں اور جن لوگوں نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ اردو افسانہ مرچکا ہے ان کے بے بنیاد دعوے کی نفی بھی ہو جاتی ہے۔ بہر حال ہمیں عرش صدیقی کے ان افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرکے اور افسانے کے ناقدین کی آراء کی روشنی میں ان افسانوں کو دیکھنا جانچنا اور پرکھنا ہے، تب ہی یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ عرش صدیقی کا دعویٰ کس حد تک درست ہے۔

یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ عرش صدیقی کا پہلا افسانہ کب اور کہاں چھپا۔ محتاط اندازے کے مطابق ان کا پہلا افسانہ "کتے" نقوش میں ۱۹۶۱ء میں چھپا اور "اک جہاں سب سے الگ" تعمیرِ انسانیت لاہور میں ۱۹۶۲ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔ بہر حال عرش صدیقی کی متاعِ افسانہ کل سولہ کہانیاں ہیں جن میں سے نو "باہر کفن سے پاؤں" میں اور سات "مسترد افسانے" میں شامل ہیں اس حوالے سے ہمیں ان صفحات میں ان سولہ کہانیوں کو پیشِ نظر رکھ کر جائزہ لینا ہے۔ پہلے "باہر کفن سے پاؤں" کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عرش صدیقی کے اس مجموعے میں نو کہانیاں شامل ہیں۔

حور کے پاؤں - بھیڑیں - تکمیل کا زخم - فرشتہ - چوتھا مجوسی -
ظلِ الٰہی - کتے - ہم نشینی کا عذاب - باہر کفن سے پاؤں

عرش صدیقی کے یہ سارے افسانے سماجی، معاشرتی، جنسی، اقتصادی اور زندگی کے دوسرے حقائق سے متعلق ہیں جن میں اس کے کسی نہ کسی پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے اور بعض پوشیدہ کیفیات کے بارے میں کھل کر انکشاف کیا گیا ہے۔ عرش صدیقی کا جو تخلیقی رویہ ان کی نظموں میں ملتا ہے وکم و بیش ان کی کہانیوں میں بھی موجود

ہے۔ فرد اور معاشرہ دونوں کے اعتبار سے یہاں بھی خوف، سراسیمگی، اور افسردگی کی فضا موجود ہے تاہم انہوں نے اپنی کہانیوں میں ایک نئی خصوصیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اندر کی شکست و ریخت، انسان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور اخلاقی انحطاط جیسے المیات ان کہانیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شمیم ترمذی[۲] نے ان کہانیوں کا تجزیہ اس طرح کیا ہے :

۱ - بھیڑیں : چاہنے اور ہونے کے درمیان امکانات کے سمندر پر پُل بنانے سے متعلق خوبصورت کہانی ہے۔

۲ - مور کے پاؤں : اس دور کے تغیر پسند اور ہجرت کے دلدادہ ایسے انسان کی شکست کی کہانی ہے جو خود کو حقیقت پسند کہتا ہے۔

۳ - تکمیل کا زخم : سسکتے انسانی رشتوں کی آخری ہچکی ہے۔

۴ - فرشتہ : خالصتاً جنس کے موضوع پر لکھی ہوئی طویل ترین کہانی ہے۔

۵ - ظلِ الٰہی : جنس کے موضوع پر لکھی ہوئی عجیب کہانی ہے۔

۶ - کتے : انسانی ہوس کی دست درازیوں کی کہانی ہے۔

۷ - ہم نشینی کا عذاب : ایک دروں بیں شخص کے اُبھر اُبھر کر ڈوبنے کی کہانی ہے۔

۸ - چوتھا مجوسی : علامت اور روایت کے دھاگے سے بُنی ہوئی وہ رنگین قبا ہے جسے عرش کے افسانے کی جامہ زیبی کی دلیل قرار دیا جاسکتا ہے۔

۹ - باہر کفن سے پاؤں : بلاشبہ اس دور کا نمایندہ افسانہ ہے اس میں کیا ہوا تجربہ اس کے موضوع کی طرح عجیب اور دل آویز ہے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف[۳] نے عرش صدیقی کے افسانوں کا کھل کر تجزیہ کیا ہے اور

یہ مضمون عرش صدیقی کی تحریروں کی طرح طویل ترین ہے اور اسے "باہر کفن سے پاؤں" میں پسِ گفتار۔ "فن و فنکار" میں شامل کیا گیا ہے یہ مضمون "عرش صدیقی کی فنِ افسانہ نگاری" ڈاکٹر اے بی اشرف کی کتابوں ادب اور سماجی عمل اور چند نئے اور پرانے افسانہ نگار میں بھی شامل ہے اور اہلِ قلم ملتان میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے بارے میں خود عرش صدیقی نے پیش گفتار" میں لکھا ہے:

"میں نے سوچا تھا کہ میں مقدمے کے طور پر اُردو افسانے اور اپنے افسانوں کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا، میں ایسا نہ کر سکا اور اب جناب اے بی اشرف کے مضمون کی شمولیت نے میرے مضمون کی ضرورت کو بالکل ختم کر دیا ہے"۔

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ڈاکٹر اے بی اشرف نے عرش صدیقی کے ان نو افسانوں کے موضوعات، کہانی کی بُنت، عرش صدیقی کی انفرادیت اور اردو افسانے کی مجموعی صورتحال کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے اور عرش صدیقی کے رویوں کو کھنگال کر رکھ دیا ہے اور اس کی روشنی میں عرش صدیقی کے افسانوں کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کے مضامین بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے کئی پہلوؤں سے عرش صدیقی کے افسانوں کو اپنے تجزیاتی مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا تذکرہ اس بحث میں آگے آئے گا۔ علاوہ ازیں خود عرش صدیقی نے اردو میں افسانہ نگاری اور اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں اپنی تحریروں اور اپنے انٹرویوز میں تذکرہ کیا ہے۔ اُسے بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اور پھر میری ان سے وہ طویل گفتگو جو "عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے" میں شامل ہے اور جسے انہوں نے اپنے مضامین کے مجموعے "تکوین" میں شامل کیا ہے زیرِ نظر رہے گی۔ اس مجموعی صورتحال کے پیشِ نظر عرش صدیقی کے افسانوں کا جائزہ مکمل قرار پائے گا اور پھر وہ آراء اور تبصرے بھی شامل ہیں جن میں "باہر کفن سے پاؤں" کے حوالے سے عرش صدیقی کی کہانی پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ عرش صدیقی کے افسانوں کے موضوعات کا تعین جس طرح میں نے

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کے حوالے سے کیا ہے اُسی طرح ڈاکٹر اے بی اشرف کے طویل مضمون کی روشنی میں ان کہانیوں کے موضوعات کو دیکھ لیا جائے تو عرش صدیقی کی کہانیوں اور فن کے بارے میں گفتگو کرنے میں سہولت ہوجائے گی۔ دیکھئے:

- بھیڑیں: کا موضوع معاشرتی زوال ہے۔
- مور کے پاؤں: نئی صورتحال کا افسانہ ہے یہ تہذیبی سفر کی کہانی ہے۔
- ہم نشینی کا عذاب: علامتی افسانہ ہے جس میں وجودیت کے عناصر بھرپور انداز میں موجود ہیں۔
- فرشتہ: بیانیہ رنگ کی کہانی ہے جس میں عرش صدیقی نے حقیقت نگار کے قلم سے معاشرے کی ناہمواریوں کو بے نقاب کیا ہے۔
- تکمیل کا زخم: ایک ہرجائی مرد فیروز کی کہانی ہے۔
- چوتھا مجوسی: تلمیحات اور امیجز کے ذریعے لکھا گیا افسانہ ہے جس میں ایک نئے آرڈر کی تلاش کا جذبہ ملتا ہے۔
- ظلِ الٰہی: کا موضوع جنسی احتیاج ہے۔
- کتے: نفسیاتی ٹریٹ منٹ کا افسانہ ہے۔
- باہر کفن سے پاؤں: اپنی علامتی تکنیک، تخلیقی توانائی، غیر معمولی تجربے اور اچھوتے تھیم کے اعتبار سے اردو کے افسانوی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو عرش صدیقی کے افسانوں کے موضوعات ان کی تکنیک، کہانی میں تجربات، اُن کے مشاہدات اور ان کہانیوں کے کرداروں کے پسِ پردہ محرکات اور ان سے وابستہ تصورات کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے اور اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ عرش صدیقی نے حقیقت اور علامت دونوں کے امتزاج سے اپنی

کہانی کا تانابانا اُستوار کیا ہے اور علامتی اور بیانیہ دونوں انداز میں کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی نے کہیں پر بھی ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ اگر چند لفظوں میں عرش صدیقی کے موضوعات کو بیان کیا جائے تو ان کہانیوں کا موضوع عورت، جنس، انسانی لالچ اور لوبھ اور اقدار کی پائمالی بنتا ہے اور ان جہتوں کو عرش صدیقی نے اپنی کہانیوں میں بیان کر کے انسان کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ان کو بیان کرنے میں جو نئی تکنیک استعمال کی ہے وہ ان کے فن کا کمال بھی ہے اور ان کی ہنر مندی کی روشن دلیل بھی۔

اب ان کہانیوں سے اقتباسات دیکھئے اور میں نے جان بوجھ کر آخری سطریں منتخب کی ہیں۔

"میرے پاؤں سخت بدنما ہوگئے تھے۔ بوجھل کالی چڑھائی ایک بھاری بدرنگ سانپ کی طرح میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اُسے کیوں کر اپنے ساتھ یہاں تک لایا تھا۔ میں نے اُسے جھٹک دینا چاہا لیکن بے سود۔ اس کی گرفت مضبوط، میری ٹانگیں دُبلی اور کمزور ہوگئی تھیں اور کالی چڑھائی کے بوجھ نے انہیں حرکت کی قوت سے محروم کردیا تھا۔ میں واپسی کے سفر کے قابل نہیں رہا تھا"۔ (مور کے پاؤں)

"اس واقعے کو ایک ہفتہ گزرگیا ہے ایسا لگتا ہے میں بدل گیا ہوں، ذہن میں نئے سوال ابھر رہے ہیں، زلیخا کی تصویر دھندلاگئی ہے۔ یہ شام دوسری تمام شاموں سے کتنی مختلف تھی۔ اس شام نے تمام امتیازات ختم کردیئے ہیں، شکوہ، شکیلہ، کلیم ان کا مالکِ مکان، جمیل، ان سب میں اب کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ سب ایک ہی راستے پر رواں ہیں، ان کے سفر کی نوعیت ایک سی ہے، وہ سب ایک سے ہیں صرف نام مختلف ہیں!!"۔ (بھیڑیں)

"اس نے ایک بڑا سا برش اُٹھایا اور اس کے دستے کی نوک کینوس پر اس زور سے ماری کہ برش کا سرا دوسری طرف نکل گیا۔ اب تصویر کے

چہرے میں بائیں آنکھ کی جگہ ایک سیاہ سوراخ، ایک چھوٹا سا دائرہ نظر آرہا تھا اور خود مجھے بھی کہ اس تصویر کا خالق تھا، تصویر کے چہرے سے خوف آنے لگا۔ "تصویر اب مکمل ہوئی ہے --- بے وقوف مصور! اس نے کہا اور قہقہہ مارتی ہوئی باہر نکل گئی"۔ (تکمیل کا زخم)

"کتنے بے چین نظر آرہے تھے وہ ہاتھ، انگلیوں میں کتنا خوفناک تناؤ تھا جیسے گردن دبوچتے ہی جان قبض کرلیں گے۔ بیگم مراد کی گردن سے کمر تک ایک کپکپی سی دوڑ گئی، نور احمد ایک دم اس کے سامنے فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پھر آگے بڑھے اور گردن کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ بیگم مراد کا جسم پسینے سے بھیگ گیا لیکن اس نے اپنے حواس قائم رکھے، پھر نور احمد نے چشم زدن میں اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں یوں ملایا جیسے دیوداسیاں دیوتاؤں کے سامنے ملاتی ہیں اور انگلیوں کی پوروں کی حِنا کو چومنے لگا، پھر اس نے اس کی کلائیوں پر اس کے رخسار ملے اور گردن اور کاندھوں پر بوسوں کی بارش کردی اور پھر اس نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور ان کے دماغ ریشمی لحافوں کی کئی تہوں کے نیچے دب کر سوگئے اور جسم جاگ اٹھے اور فرش پر ان دو جسموں نے نئی زندگی کی داستان لکھی۔ اور نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک جسم نے دوسرے سے کہا "مراد میاں سے طلاق لے لو" اور دوسرے جسم نے جواب دیا "نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں!" (فرشتہ)

"کئی سوال ذہن میں گڈ مڈ ہو گئے تھے میں اس سے یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کیوں کر آپہنچی تھی لیکن میں کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہ کرسکا۔ بچے کو گود میں لئے ہوئے میں اس کے قریب ہوگیا اور ڈرتے ڈرتے اپنا منہ اس کے دائیں کان کے قریب لے جاکر میں نے کہا "مریم میں آگیا ہوں" اور جب ہم تینوں غار سے باہر آئے تو باہر تیز بارش ہو رہی تھی"۔ (چوتھا مجوسی)

"ایک طوائف کو ظلِ الٰہی کہتا تھا وہ جہنمی تھا --- میں نے اسے جہنم واصل کردیا ہے، میں نے اسے اس کے گناہ کی سزا دی ہے اب اس کی گندی زبان کبھی خدا کی بے حرمتی نہیں کرسکے گی۔" (ظلِ الٰہی)

"چیخ کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے چچی اور خادمہ بھاگی آئیں پروین کا جسم پسینے میں تر تھا اور وہ بری طرح کانپ اور ہانپ رہی تھی جیسے نہ معلوم کتنی دور سے بھاگی چلی آرہی ہو چچی نے اسے سر سے پاؤں تک اپنے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے پریشانی کے ساتھ پوچھا "کیا ہوا بیٹی کیا بات ہے۔ پروین بیٹی خیر تو ہے کیا خواب میں ڈر گئی ہو"۔ "جی - جی - وہ - وہ -"، پروین نے کانپتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔ "وہ وہ کیا بیٹی؟" چچی نے پیار سے پوچھا۔ "وہ - وہ - کتے - کتے!" پروین نے یوں ڈرتے ہوئے کہا جیسے کوئی گالی دے رہی ہو۔" (کتے)

" آرام سے نیچے اُتر آؤ ورنہ گر جاؤ گے۔ اتنی بلندی سے گر کر بچ نہ سکو گے دیکھو صادق تو کھڑکی سے گرتے ہی مر گیا تھا۔ اسد مسکراتا رہا۔ آصف نے رومال سے اچھی طرح آنکھوں کو صاف کیا اور پھر غور سے دیکھا، اسد وہاں موجود نہیں تھا، صرف بادل کا ایک ٹکڑا ہوا میں معلق تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ان اوراق کو پڑھنے لگا جو اسے صادق کی جیب سے ملے تھے۔ دروازے سے کمرے میں داخل ہوکر جب میں دروازہ بند کرتا ہوں تو دل ہی دل میں کہتا ہوں "اے دروازے میرے محسن، میں تیرا ممنون ہوں"۔ (ہم نشینی کا عذاب)

"اب میں اس براعظم میں نہیں رہ سکتا تھا جس نے مجھے مردہ قرار دے دیا تھا۔ اور اب مجھے زندگی بھی بے حد عزیز ہوگئی تھی۔ میں اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے اس براعظم سے خوف آرہا تھا جس میں میں مرچکا تھا۔ پھر میں وہاں سے بہت دور نکل گیا اور ایک اور براعظم میں

پیدا ہوا، میں اب بھی زندہ ہوں۔ یہاں میں کبھی نہیں مروں گا۔ یہاں میرے بچے ہیں اور پوتے پوتیاں ہیں۔ یہاں میں زندہ رہوں گا۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ! لیکن میں اپنی موت والی واردات کبھی نہیں بھول سکتا اور یہ بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اگر میں اس بر اعظم میں زندہ ہوں تو اُس شام جس دوسرے شخص کو اُس دوسرے براعظم میں لوگوں نے میرے دادا جان کی قبر میں اُتارا تھا۔ کون تھا؟'' (باہر کفن سے پاؤں)

یہ تمام اقتباسات جہاں عرش صدیقی کے افسانوں کے موضوع کو واضح اور اجاگر کرتے ہیں وہاں ان کے اسلوب کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور کہانی کی تکنیک اور ٹریٹ منٹ کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور یوں عرش صدیقی کے فن پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

اس تناظر میں اُس پس منظر کا بھی علم ہو جاتا ہے جن کے گرد یہ کہانیاں گھومتی ہیں۔ افسانے کے ناقدین نے عرش صدیقی کے افسانوں کو ان کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو سراہا ہے اور انہیں عہدِ حاضر کے منفرد افسانے قرار دیا ہے، ان آراء کی تفصیل یہ ہے:

''باہر کفن سے پاؤں' اُردو افسانے کے روشن مستقبل کی بشارت ہے اور عرش صدیقی نے یہ بشارت ہمیں اس وقت فراہم کی جب کلاسیکی افسانہ حقیقت نگاری کے باعث اپنی آبرو کھو چکا تھا اور جدید افسانہ تجریدی غلو کے سبب اپنے وقار سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ 'باہر کفن سے پاؤں' کو کردار نگاری نفسیات آشنائی اور ماحول شناسی کے اعتبار سے ایک ایسے مثالی پیکر کا اعزاز حاصل ہے جسے عرش صدیقی کی کائنات دوستی نے کائنات کی سی وسعت ہی سے ہمکنار نہیں کیا بلکہ اس کے رنگ روپ سے بھی ہم آغوش کیا ہے''۔ (عارف عبدالمتین)[۵]

''عرش صدیقی نے حقیقت کو علامتی وجود اور جنسی زاویے سے دیکھا ہے

اور ہمیشہ رہنے ولا تاثر پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے عمل پر ردِ عمل کی شدت بھی نمودار ہوتی ہے لیکن وہ زندگی کو ریزہ ریزہ نہیں کرتے، اور فرد کے علاوہ معاشرے کے جذباتی تشنج کو بھی مائل بہ اعتدال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر افسانے کی اشاعت پر اہلِ ادب نے ان کی طرف چونک کر دیکھا اور پھر ان کی پذیرائی کے لئے گردن جھکادی"۔ (ڈاکٹر انور سدید)[۶]

"محمد حسن عسکری کے بعد شاید عرش صدیقی پہلے ادیب ہیں جن کے افسانوں کے نہایت مختصر مجموعے نے انہیں اتنی شہرت عطا کی ہے کہ لوگ برسوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد بھی نہ پاسکے"۔ (منظر امکانی)[۷]

"عرش صدیقی کے افسانوں کا فکری پہلو بڑا توانا اور دائمی اہمیت کا حامل ہے۔ جہانِ باطن اور جہانِ آب و گِل کے ارتباط و اشتراک کا اُنہیں گہرا شعور حاصل ہے۔ انسان کے داخلی جہان کی گتھیوں کو سلجھانے اس کے لاینحل مسائل کی تحلیل اور انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو تجزیے کی طرف ان کا صحت مند میلان ہمارے افسانوی ادب میں انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔" (گلزار وفا چوہدری)[۸]

" عرش صدیقی کے افسانوں میں بنیادی رجحان جنس ہے ...... جنسی موضوع عرش صدیقی کے یہاں منٹو اور عصمت کے افسانوں کی طرح کِسی سماجی یا تہذیبی پس منظر سے نہیں اُبھرتا بلکہ یہ محض ذہنی عیاشی اور جسمانی طاقت سے جنم لیتا ہے" (ڈاکٹر فردوس انور قاضی)[۹]

"عرش صدیقی نے متنوع موضوعات کے برتاؤ کے ساتھ ساتھ روایتی طرزِ اظہار سے علامت اور تجدید کے معتدل ورتارے تک سفر کیا ہے۔ ان میں انسانی نفسیات سے گہرا شغف اور بیان میں شگفتگی کا عنصر قابلِ لحاظ ہے۔ ان کے ہاں تیسری سمت کی تلاش بھرپور معنویت کی حامل

ہے"۔ (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ)[۱۰]

"عرش کے سارے افسانے دو خاموشیوں کے درمیانی وقفے یعنی مختصر اور ناپائیدار زندگی سے مواد حاصل کرتے ہیں۔ یہ افسانے نہ تو سوئے افلاک کی اس قدسی فضا کے حامل ہیں جہاں تک پڑھنے والے کا ذہن پرواز نہ کر سکے اور نہ زمینی اتفاقات اور قیاسیات کی بیساکھیوں پر چلتے ہیں کہ باشعور قارئین کی نازک سوچ پر گراں گزریں۔ یہ افسانے ہماری حقیقی زندگی کی خوشیوں، حادثوں، خواہشوں اور پریشانیوں کی سچی تصویریں ہیں، ان کا تعلق ہماری اپنی زمین سے ہے۔ ہمارے سماج سے ہے، ہمارے اپنے دور سے ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔" (ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی)[۱۱]

"باہر کفن سے پاؤں" کے یہ نو افسانے زندگی کی تفہیم کے لئے نو بلیغ استعارے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بیشتر افسانے متوسط طبقہ کے کرداروں کے گرد گھومتے ہیں اور بظاہر یہ ان کی زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں، لیکن یہ ان افسانوں کا ظاہری پہلو ہے اس لئے عرش صدیقی کے افسانوں میں کردار محض ایک کردار بن کر نہیں آتا، بلکہ بالعموم وہ ایک خاص نوع کے فرد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے بطور ایک "اشاریہ" آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی میں عرش صدیقی کے فن کی اہمیت پنہاں ہے۔" (ڈاکٹر سلیم اختر)[۱۲]

"ان افسانوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عرش کی تخلیقی شخصیت یہاں بھی بند نہیں وہ ایک مشاق فن کار کی طرح افسانے کی فضا اور کردار مربوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہلکی پھلکی رواں دواں نثر، جزئیات پر ماہرانہ قدرت اور افسانے کے پورے نقشے کو بچے تلے طریقے سے قاری پر کھولنے کی چابکدستی عرش کے فن کے اہم عناصر ہیں۔ وہ افسانوں میں فالتو مواد اور غیر متعلق بحثوں کو شامل نہیں کرتے۔ متوسط طبقے کا ماحول

ان کے فن کی جولانِ گاہ ہے"۔ (ڈاکٹر وحید قریشی) [۱۳]

"عرش صدیقی کے یہاں زندگی میں ڈوب کر غم ہوجانے کی خواہش نہیں بلکہ زندگی کو ایک فاصلے سے برتنے کی تمنا پائی جاتی ہے، جو اپنی جگہ ایک مثبت رویہ ہے۔ عرش صدیقی کے یہ افسانے آج کے بے یقینی اور شکست و ریخت کے دور میں زندگی کو ایک نئی معنویت عطا کرنے کی فنکارانہ سعی ہے۔ عرش کی یہ کوشش چونکہ ارتقائے حیات کے سفر میں فنکار کے تہذیبی کردار کی نشاندہی کرتی ہے اس لئے قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ تحسین بھی۔" (توصیف تبسم) [۱۴]

"اردو افسانے کی تاریخ میں تین نہایت اہم موڑ ایسے ہیں جہاں سے نئی جہتوں اور نئے رویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اردو افسانے کے ارتقاء کی بنیاد یہی موڑ بنتے ہیں۔ پہلا موڑ وہ ہے جب پریم چند نے "کفن" لکھ کر ترقی پسند افسانہ نگاروں کو نئی راہ سُجھائی۔ دوسرا موڑ وہ ہے جب محمد حسن عسکری نے "چائے کی پیالی" لکھی، ایسے افسانوں کے ذریعے اردو افسانے کو ایک نئی سمت عطا کی اور تیسرا موڑ وہ ہے جب عرش صدیقی نے "باہر کفن سے پاؤں" کے افسانے لکھ کر اردو افسانے کے لئے ایک بالکل نئی منزل کا تعین کردیا۔ حسن عسکری کا فنی سفر جہاں ختم ہوا، عرش صدیقی نے اپنے فنی سفر کا آغاز ہی وہاں سے کیا اور یوں وہ اردو افسانے کو بہت آگے لے گئے۔ عرش صدیقی کا فن ہئیت اسلوب اور موضوع ہر اعتبار سے منفرد ہے۔ ہمہ گیری تنوع اور جدت و تازگی کا احساس ان کے یہاں بہت گہرا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے تمام تر انفرادی اور اجتماعی پہلو ایک ساتھ موضوع بنتے ہیں، کیونکہ وہ زندگی کے پیچیدہ کرداروں کو ہمیشہ سامنے رکھتے ہیں۔" (ڈاکٹر اے بی اشرف) [۱۵]

ان آراء کی روشنی میں "باہر کفن سے پاؤں" کے افسانوں کے موضوعات، ان

کے کرداروں، معاشرتی خدوخال اور سماجی تناظرات کے ساتھ ساتھ عرش صدیقی کے اسلوب اور فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اوراس طرح یہ بات طے کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ افسانے اپنے عہد کے افسانوں سے ہر لحاظ سے منفرد اور الگ تھلگ ہیں اور اردو افسانے کو ایک نئی سمت اور جہت عطا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے عرش صدیقی کو عہد ساز افسانہ نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر[۱۶]:

"'باہر کفن سے پاؤں' اردو میں گراں قدر اضافہ ہی نہیں، آج کے افسانے کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف[۱۷] نے اپنے طویل مضمون میں جس کا تذکرہ اوپر کے صفحات میں ہوا ہے، صحیح تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عرش صدیقی لامرکزیت، اقدار کی شکست و ریخت، ذات کی گمشدگی، عقائد کی پامالی، مستقبل کی بے یقینی اور تہذیبی خلا کے اس دور میں وجود کے جواز اور زندگی کی نئی معنویت کو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور ان کی یہ سعی ارتقائے حیات میں ادیب اور فن کار کے نہایت اہم رول کی نشاندہی کرتی ہے"۔

یوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ "باہر کفن سے پاؤں" اردو افسانے کو نئے ذائقوں سے روشناس کراتا ہے۔

عرش صدیقی کے بارے میں ایک بات یہ طے ہے کہ وہ انتخاب کے بہت قائل ہیں۔ نظموں کے سلسلے میں ان کے اس رویے کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ افسانوں کے بارے میں بھی وہ اسی نظریے اور رویے کے قائل ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے جو افسانے لکھے اور ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں بھی چھپے مگر عرش صدیقی نے انہیں باہر کفن سے پاؤں میں شامل نہ کیا۔ میری اس سلسلے میں ان سے گفتگو ہوتی رہی اور میں انہیں قائل کرتا رہا کہ ان افسانو ں کو بھی الگ شائع ہونا چاہیے تاکہ آپ کے افسانہ کے ارتقاء کے بارے میں سارے افسانوں کو پیشِ نظر رکھ کر گفتگو ہو سکے اور حقیقت

نگاری سے علامت نگاری تک کا سفر جو آپ نے طے کیا ہے اس کا جائزہ لیا جا سکے۔ یوں میں برابر تقاضا کرتا رہا اور بالآخر انہیں منالیا۔ مگر اس سے پہلے میں نے ان سے ان افسانوں کی اشاعت کے جواز کے بارے میں ایک طویل مکالمہ کیا جو "عرش صدیقی کے "سات مسترد افسانے" کے آغاز میں شامل ہے۔ اسے میں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "لمحہ' موجود - ادب اور ادیب"[19] میں بھی شامل کیا ہے اور عرش صدیقی نے اپنے تنقیدی مضامین "تکوین"[20] میں اسے "اردو افسانہ - ترجیحات اور صورتحال (ایک مکالمہ)" کے نام سے شامل کیا ہے۔

اس مجموعے کی اشاعت کے بعد اس کے بارے میں ملی جلی آراء کا اظہار ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جب مصنف نے انہیں رد کردیا تو پھر ان کے چھاپنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ بہت سے ادیبوں نے اس کوشش کو سراہا کہ یہ افسانے بہرطور عرش صدیقی کے تخلیقی اظہار کی نمایندگی کرتے ہوئے اس دور کے رویوں اور رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس کتاب کو خاص پذیرائی ملی۔ اور بہت سے لوگوں نے اس کتاب کی فرمائش کی اور پھر اس کے بارے میں خطوں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے لکھا:

> "اب کے ملتان یاترا کے دوران آپ کی عدم موجودگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ آپ کی نئی کتاب "عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے" عرش صاحب نے عطا کی۔ میں صرف مکالمہ ہی پڑھ سکا تھا کہ طلبہ نے اس کتاب کا مطالعہ اتنے انہماک اور اشتیاق سے شروع کر دیا کہ کتاب اب تک مجھے واپس نہیں ملی۔ اس امر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ افسانے کتنے دلچسپ ہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ عرش صاحب کو ان کی اشاعت پر رضامند کرلیا"۔ (۱۱-اپریل ۱۹۸۹ء)

اسی طرح کراچی سے شہزاد منظر[21] نے لکھا:

> "آپ نے عرش صدیقی کے افسانوں کا انتخاب "سات مسترد افسانے"

بھیج کر مجھ پر بڑا کرم کیا ہے بلکہ اسے احسان کہنا مناسب ہوگا۔ میں لفظ "احسان" تکلفاً استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقیقی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں ...... آپ کا پیش لفظ اور عرش صاحب سے مکالمہ خوب ہے۔ میں نے اس سے قبل اس قدر عمدہ اور بے باک انٹرویو نہیں پڑھا۔ انٹرویوز میں عام طور پر ہمارے ادیب ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالتے ہیں، لیکن عرش صاحب کی طرح اتنی معقول، مدلل اور عالمانہ گفتگو کہیں نہیں پڑھی۔ اس انٹرویو نے میرے دل میں عرش صاحب کا احترام مزید بڑھا دیا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس میں عرش صاحب نے جو جو باتیں کہیں ہیں ان تمام باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ انٹرویو پڑھ کر میں نہ صرف ان کی عظمت کا قائل ہوگیا بلکہ مجھے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ افسانے کے ناقدین نے ان کے فن سے انصاف نہیں کیا" (۲۱۔ جنوری ۱۹۹۵ء)

اور دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ افسانے کے ناقدین نے اپنے گروپ سے متعلق افسانہ نگاروں کے ناموں کی فہرست میں تکلفاً عرش صدیقی کا نام بھی درج کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں سوائے چند قریبی لوگوں کے اور کسی نے قلم نہیں اٹھایا بلکہ یہ اعتراض وارد کیا کہ صرف نو افسانوں کے مجموعے کی افسانوی ادب میں کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے۔ لیکن جن ناقدین نے ان کے افسانوں کے بارے میں لکھا، کھل کر لکھا اور ان کے افسانوں کے بارے میں دیانت دارانہ رائے کا کھلے عام اظہار کیا۔

جہاں تک عرش صدیقی کے سات افسانوں کا تعلق ہے ان میں "اک جہاں سب سے الگ" - "آڑے ترچھے خطوط" - "صحرا" - "سناٹا" - "شہزادی" - "سُونا آنگن" اور "اونچا روزگار" شامل ہیں۔ یہ سارے افسانے اردو افسانے کی حقیقت پسند روایت اور رومانوی تحریک سے وابستہ ہیں، تاہم ان میں عرش صدیقی نے معاشرتی اور تہذیبی صورتحال کے پس منظر میں جو شعوری رویہ اپنایا ہے وہ ان کے بعد کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے بلکہ

وابستہ ہونے کی بناء پر ان کا افسانہ اسی مینی فیسٹو کے گرد گھومتا ضرور ہے مگر اس سے مختلف بھی ہے کہ اس میں شعور کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ چونکہ یہ افسانے اس عہد میں مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے اس لئے کسی نہ کسی حوالے سے گفتگو کا حوالہ بھی رہے۔ چنانچہ گلزار وفا چوہدری کے جس مضمون کا حوالہ پہلے آچکا ہے جس کا عنوان ''عرش صدیقی کے افسانوں کا فکری پہلو'' ہے اس میں نئے افسانوں کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں سے بھی بعض کا تذکرہ موجود ہے مثلاً ''سونا آنگن'' - ''اونچا روزگار'' اور ''شہزادی'' شامل ہیں۔ ظاہر ہے یہ افسانے اس عہد کے رویوں کے عین مطابق لکھے گئے ہیں اور ناقدین کو یہ گمان گزرتا ہے کہ عرش صدیقی منٹو سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے مگر گلزار وفا چوہدری کی یہ بات زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے جہاں انہوں نے منٹو اور عرش کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''عرش صدیقی اپنے موضوعات کے اعتبار سے منٹو سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی توجہ کا محور زیادہ تر جنسی مسائل ہی ہیں البتہ جنسی مسائل کے بیان میں ان کے ہاں منٹو کی جرأتِ اظہار کی جگہ رمزیت ہے۔ عرش صدیقی کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے، جہاں منٹو زندگی اور ماحول کی بھرپور عکاسی کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوگئے ہیں وہاں عرش ان حدوں سے آگے بڑھ کر مسائل کی تحلیل کرتے ہیں اور ان کے منطقی نتائج اخذ کرتے ہیں۔''[۲۲]

لمحۂ موجود میں دیکھا جائے تو افسانہ اب اپنی حقیقت کی طرف لوٹ رہا ہے اور خود نئے افسانہ نگاروں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ کہانی کے بغیر چارۂ کار کوئی نہیں۔ اس سلسلے میں خالدہ حسین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے آج بھی منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے مجموعے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ عرش صدیقی کے یہ سات مسترد افسانے بھی اردو افسانے کی روایت کا حصہ ہیں۔ میرے نزدیک ''حوا'' - ''شہزادی'' - ''اک

جہاں سب سے الگ" اور "سناٹا" جیسے افسانے یقینی طور پر زندہ رہنے والے افسانے ہیں اور منٹو یا کرشن چندر کے افسانوں کی طرح ان میں بھی یہی خصوصیت ہے کہ انہیں ہر عہد میں پڑھا جا سکتا ہے، اور ان سے لطف اندوز بھی ہوا جا سکتا ہے۔ خود عرش صدیقی نے ان افسانوں کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تفصیل سے بتایا:

عرش صدیقی "ان مسترد افسانوں میں رومان کے عناصر ضرورت سے زیادہ ہیں اور ایسا بڑی حد تک جوانی کی عمر میں لکھے جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یوں کہ لیجئے کہ ان افسانوں کا دائرہ محدود ہے۔ اور ان میں فکری عناصر کم ہیں اس لئے اس دور کی تحریر میں ہمیشہ تو نہیں مگر اکثر کسی ایک جانب جھکاؤ بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس دور کے تجربوں کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے اظہار پر کچھ شرائط ضرور عائد کی جا سکتی ہیں گو کہ یہ ہر فن کار کا ذاتی حق ہوگا اور وہ ایسا کرنے یا نہ کرنے کا حق رکھے گا۔ مثلاً میرا ایک افسانہ ہے "سناٹا" ایک افسانہ قاسمی صاحب کا اسی نام سے ہے۔ میرا افسانہ ان کے افسانے سے مختلف ہے، لیکن ان کا افسانہ میرے افسانے سے کہیں بہتر ہے۔ اب میں یہ افسانے مسترد کیوں نہ کروں یہ افسانہ عنفوانِ شباب کے جذبوں کے اظہار سے آگے نہیں جاتا"۔

طاہر "صرف یہی ایک افسانہ ایسا ہے جس کے بارے میں آپ رائے دے سکتے ہیں (مگر سب لوگوں کی یہ رائے نہیں ہے آپ کا افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بہتر بھی قرار دیا جا سکتا ہے) مگر اپنی جگہ یہ افسانہ بھی اہم ہے۔ دوسرے تمام افسانے "صحرا" - "اک جہاں سب سے الگ" - "شہزادی" - "سُونا آنگن" --- محض جبلتوں یا جذبات کے اظہار تک محدود نہیں، ان میں انسانی نفسیات کا شعور پوری طرح جھلکتا ہے۔ ان کی بنت میں بتدریج تہ داری آئی ہے۔ "صحرا" محبت کے حوالے سے انسانی نفسیات کا ایک شاندار

مطالعہ پیش کرتا ہے۔ ''شہزادی'' ایک دلچسپ کہانی ہے، جو رومانی بھی ہے اور ماضی اور حال دونوں کا حوالہ رکھتی ہے، اور مستقبل کا بھی۔ اور پھر یہ محض محبت کی کہانی نہیں ہے اس میں طرزِ حکومت، جمہوریت اور بادشاہت کے حوالے بھی موجود ہیں۔ اس میں زندگی گذارنے کے مختلف رویوں پر تنقید موجود ہے۔ ''سُونا آنگن'' انسان کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات پر ایک عمدہ افسانہ ہے۔ ''اونچا روزگار'' آپ پر ترقی پسند تحریک اور بے رحم حقیقت نگاری کی تحریک کے اثرات کا مظہر ہے اور اس میں آپ نے رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک دونوں کے اثرات کو قبول کیا ہے۔'' [۲۳]

ان افسانوں کے بارے میں اور خود عرش صدیقی کی افسانہ نگاری کے بارے میں معلومات مکالمہ میں موجود ہیں۔ میرے نزدیک ان کی اتنی اہمیت ضرور ہے کہ یہ یکجا ہو گئے ہیں اور عرش صدیقی کی افسانہ نگاری کے تسلسل کا ایک حصہ بن گئے ہیں اور یہ افسانے ''باہر کفن سے پاؤں'' کے افسانوں کا مطالعہ کرنے اور عرش صدیقی کے فن اور ان کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں معاونت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد امین نے اس کتاب پر جو تبصرہ لکھا ہے اس میں وہ رقمطراز ہیں:

''میرے نزدیک ان کی اشاعت کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ آج بھی ہمارے ماحول میں ایسے واقعات اور ایسے کردار موجود ہیں۔ جب ایسی کہانیاں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں تو پھر ان کا لکھنا اور چھاپنا بجائے خود جواز ہے۔ طاہر تونسوی کی یہ کاوش قابلِ قدر ہے جس سے یہ افسانے ضائع ہونے سے بچ گئے...... ان افسانوں کا اسلوب نسبتاً زیادہ رومانوی ہے۔ فضا بندی پر خاص توجہ دی گئی ہے اور شاعرانہ تخیل سے کام لیا گیا ہے۔ اردو افسانے میں تجدیدیت کی تحریک سے کہانی معمّہ بن گئی ہے اور تجدیدیت میں گم ہوگئی۔ عرش صدیقی کا اسلوب علامتی ضرور ہے مگر ان میں کہانی موجود ہے''۔ [۲۴]

اس تناظر میں دیکھا جائے تو عرش صدیقی کے یہ سولہ افسانے سولہ آنے سچے اور کھرے ہیں اور ان میں رومان، بے رحم حقیقت نگاری، انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور تمام تر معاشرتی خدوخال اور انسانی جبلتیں کھل کر سامنے آتی ہیں اور اسی میں عرش صدیقی کا کمال ہے۔

حوالہ جات

۱- مآثرالاجداد از منظورالحق صدیقی ص ۱۹۳

۲- ادب آثار از ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کاروانِ ادب ملتان۱۹۹۶ ص ۲۱-۹

۳- باہر کفن سے پاؤں از عرش صدیقی ۲۶۶-۲۲۹ (عرش صدیقی کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر اے بی اشرف)

ادب اور سماجی عمل از ڈاکٹر اے بی اشرف کاروانِ ادب ملتان ۱۹۸۰ ص ۱۱۸-۹۷،

کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار از ڈاکٹر اے بی اشرف سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، اہلِ قلم ملتان

۴- باہر کفن سے پاؤں از عرش صدیقی ص ۱۴

۵- فلیپ باہر کفن سے پاؤں از عارف عبدالمتین

۶- عرش صدیقی کے افسانے از ڈاکٹر انور سدید، امروز لاہور ۲۰-جون ۱۹۸۰ء

۷- ملاقات از منظر امکانی، آہنگ کراچی ۷-اگست ۱۹۸۰ء

۸- عرش صدیقی کے افسانوں کا فکری پہلو از گلزار وفا چوہدری، مجلّہ افکار مرے کالج، سیالکوٹ ۱۹۶۸ء

۹- اردو افسانہ نگاری کے رجحانات از ڈاکٹر فردوس انور قاضی مکتبہ عالیہ لاہور ص ۵۴۷

۱۰- افسانے کا منظر نامہ از مرزا حامد بیگ مکتبہ عالیہ لاہور ص ۸۵-۸۴

اردو افسانے کی روایت از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد ۱۹۹۱ ص ۱۰۹

۱۱- ادب آثار از ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کاروانِ ادب، ملتان ۱۹۹۶ء ص ۱۰

۱۲- عرش صدیقی کے افسانے از ڈاکٹر سلیم اختر، ماہ نور لاہور، مئی ۱۹۸۴ء

افسانہ اور افسانہ نگاری، تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳۲

۱۳ - عرش صدیقی کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر وحید قریشی، اوراق لاہور، افسانہ نمبر، دسمبر ۱۹۶۹ء تا جنوری ۱۹۷۰ء

۱۴ - تبصرہ باہر کفن سے پاؤں از توصیف تبسم، نشریہ ریڈیو پاکستان اسلام آباد، ۱۳۔ مئی ۱۹۷۹ء

۱۵ - عرش صدیقی کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر اے بی اشرف، مشمولہ باہر کفن سے پاؤں

۱۶ - فلیپ باہر کفن سے پاؤں از ڈاکٹر سلیم اختر

۱۷ - عرش صدیقی کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر اے بی اشرف مشمولہ باہر کفن سے پاؤں ص ۲۶۶

۱۸ - عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے، مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی بیکن بکس، ملتان ۱۹۸۸ء، ص ۴۶۔۱۳

۱۹ - لمحۂ موجود ۔ ادب اور ادیب از ڈاکٹر طاہر تونسوی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

۲۰ - تکوین از ڈاکٹر عرش صدیقی مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۷ء، ص ۵۳۸۔۲۰۹

۲۱ - خط بنام ڈاکٹر طاہر تونسوی از ڈاکٹر غلام حسین اظہر، ۱۱۔اپریل ۱۹۸۹ء

۲۲ - خط بنام ڈاکٹر طاہر تونسوی از شہزاد منظر ۲۱۔ جنوری ۱۹۹۵ء

۲۳ - عرش صدیقی کے افسانوں کا فکری پہلو از گلزار وفا چوہدری، مجلّہ افکار مرے کالج، سیالکوٹ ۱۹۶۸ء

۲۴ - عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی ص ۲۵۔۲۳

۲۵ - تبصرہ عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے از ڈاکٹر محمد امین دائرے، کراچی، جنوری۔ فروری ۱۹۹۵ء

عادل خلقت شور مچائے، ہوا ہوئے سنجوگ
نفرت کے دشمن ٹکڑوں میں، بٹے ہوئے ہیں لوگ

حاکم اور محکوم سبھی کو، ہے اس گھر کی تلاش
جس پر سایہ افگن ہو، غم خواری کا آکاش

میرے پاس علاج ہے اس کا، سنو فقیر کی بات
کالی کملی اوڑھ لو سارے، کملی میں بارات

عرش صدیقی (عادل فقیر)

کملی میں بارات کا متلاشی

دوہا

''کملی میں بارات'' عرش صدیقی کے نعتیہ اور اخلاقی دوہوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے روزنامہ امروز ملتان میں عادل فقیر کے نام سے لکھے اور اس نام کو بڑے عرصے تک صیغۂ راز میں رکھا۔ مرزا ابن حنیف چونکہ ان دنوں روزنامہ امروز میں کام کرتے تھے اس لئے انہیں اس بات کا پتہ تھا اور یہ بات میرے علم میں بھی تھی تاہم باقی اہلِ ملتان کو اس کا علم نہیں تھا۔ بہت بعد میں عرش صدیقی نے خود اس کا انکشاف کیا۔ عرش صدیقی اپنی شخصیت کے اعتبار سے تصوف کی طرف مائل تھے اور اندر سے ایک صوفی تھے، اس لئے ان رویوں کا اظہار انہوں نے دوہے کی شکل میں کیا۔ اس سے قبل اردو میں دوہا نگاری ان کی تنقید کا موضوع رہی اور انہوں نے بے شمار مضامین لکھے جو ماہِ نو اور اوراق میں شائع ہوئے۔ ان سب مضامین کو انہوں نے یک جا اور مربوط کر کے ''پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء'' عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرادیا اور اس میں ''کملی میں بارات'' کے نام سے دوہے بھی شامل کئے۔ دوہے میں استعمال ہونے والی بحروں کو انہوں نے عالی چھند اور دل محمد چھند کا نام دیا۔ ۹۸ صفحات پر محیط ایک مبسوط مضمون ''پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء'' کے سلسلے میں ایک اہم تحقیقی و تنقیدی دستاویز ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے رشید قیصرانی کے دوہوں کے مجموعے ''نین جزیرے'' [1] کا ۱۹ صفحات پر مشتمل دیباچہ بھی تحریر کیا ہے جس میں دوہے کی صنف موضوع اور ہیئت سے بحث کی گئی ہے۔

عرش صدیقی نے جو دوہے عادل فقیر کے نام سے لکھے ان کا صوفیانہ مزاج پورے تخلیقی شعور کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ دوہوں کو انہوں نے مختلف

عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ کملی میں بارات -- ہیرا موتی راکھ --- کس کو کریں وکیل --- پیار کے روپ ہزار --- مایا اونچی ذات --- کرسی اور تقدیر --- سن مرغے کی بانگ، عالی چھند میں لکھے گئے ہیں۔ خواجہ دل محمد چھند میں لکھے گئے دوہے پھیکا پکوان --- خالی ہاتھ فقیر --- دُکھ سکھ --- آدھوں آدھ --- پاؤں میں تقدیر --- جھوٹ سچ --- اور عادل ڈنڈی مار شامل ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم[۲] نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عرش صدیقی کے طویل مضمون پر سیر حاصل بحث کی ہے اور عرش صدیقی کی اس کوشش کو سراہا ہے کہ انہوں نے اپنے اس مضمون میں دوہے کے ارتقاء، اس کی ماہیت، اس کے موضوعات اور دوہا نگاروں کے بارے میں تفصیلات مہیا کی ہیں۔ یوں دوہا نگاری کی ایک تاریخ مرتب ہوگئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"یہ مقالہ پانچ ذیلی عنوانات میں تقسیم ہے یعنی پس منظر، ارتقاء، موضوعات، زبان اور بحر۔ مصنف نے ان موضوعات کو جس طرح آگے بڑھایا ہے اور اُن پر جس طرح بحث کی ہے اس سے اُس کے مطالعہ کی وسعت اور اُس لگن کا اندازہ ہوتا ہے جو لکھنے والے کو اپنے موضوع سے ہے۔ ڈاکٹر عرش کا نقطہء نظر نتائج کے اخذ کرنے میں بڑی حد تک معروضی ہے وہ جو کہتے ہیں اس کو مناسب دلائل و شواہد سے مستحکم بھی بناتے ہیں ان کی آراء سے اختلاف کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے"۔

اور اس میں حقیقت بھی ہے کہ جس مدلل انداز میں عرش صدیقی نے دوہے کی ارتقائی منازل اور اس کے تدریجی پہلوؤں پر بحث کی ہے اُس کے لئے اتنے ہی مطالعے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم نے عرش صدیقی کے دوہوں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے :

"ان دوہوں کی زبان پاکستان کی وہ زبان ہے جس میں مقامی زبانوں

کے لفظ شامل ہوتے جارہے ہیں۔ پاکستان کی یہ ارتقاء پذیر زبان اُس زبان سے مختلف ہے جو برصغیر کے دوسرے علاقوں میں بولی اور لکھی جارہی ہے"۔

بہرحال عرش صدیقی نے جو دوہے لکھے ہیں ان کی فکری سطح بہت بلند ہے اور ان میں وہ چاشنی کم ہوگئی ہے جو دوہے کا خاصا ہے مگر یہ موضوع کا تقاضا بھی ہے اور آہنگ و اظہار کا بھی تاہم ان کی تاثریت اور گہرائی اور گیرائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور پھر یوں بھی اس طرح کے دوہے اگر پہلی بار نہیں تو ایک مربوط فکری نظام کے تحت لکھے گئے ہیں۔ عاصی کرنالی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" [۳] میں عرش صدیقی کے ان نعتیہ دوہوں کا تذکرہ کیا ہے وہ رقمطراز ہیں:

"ڈاکٹر عرش صدیقی، ادیب، شاعر، محقق اور نقاد کی حیثیت سے نامور شخصیت --- کئی نثری اور شعری کتابوں کے مصنف ہیں۔ شاعری میں روایتِ جنوں سے منحرف اور رویہء خرد افروزی کے پرچارک --- کلام میں عصری حسیت اور شعور کی رو --- جزواً حمد ونعت کہی ہے۔ "کملی میں بارات" کے نام سے دوہے طبع ہوئے ہیں۔ دوہوں میں تصوف کا ذوق رچا ہوا ہے اور خدا اور رسولِ خدا سے محبت، شیفتگی اور شعور آمیز والہانہ پن کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ عرش صاحب نے عادل فقیر ے نام سے دوہے کہے ہیں۔

حمد : عادل خلقت شور مچائے ہوا ہوئے سنجوگ
نفرت سے دشمن ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں لوگ

میرے پاس علاج ہے اس کا سنو فقیر کی بات
کالی کملی اوڑھ لو سارے کملی میں بارات

نعت: عادل میرا فخر محبت عجز لحاظ نیاز
تیرا فخر حقارت عہدہ، کرسی، کبر مجاز

تیرا فخر وہ عدل ترازو جس کے جھوٹے باٹ
میرا فخر فقیری والی ٹوٹی ہوئی اک کھاٹ

(کملی میں بارات ص ۱۰۴ - ۱۰۳)

ڈاکٹر عرش صدیقی نے ان دوہوں میں "عادل فقیر" کے نام کی مناسبت سے عادل اور فقیر دونوں لفظوں کو ان کی معنویت کے اعتبار سے استعمال کیا ہے اور ان سے ایک الگ جہانِ معنیٰ پیدا کیا ہے۔ اس کی بدولت ان کے مفاہیم میں وہ عظمت پیدا ہوگئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول سے مختص ہے۔ اس سے جہاں ڈاکٹر عرش صدیقی کی عقیدت و محبت کا واضح اظہار ہوتا ہے، وہاں دوہے کی بحروں پر ان کے فنی عبور اور گرفت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے اور پھر ان کی اس تخلیقی صلاحیت کا بھی علم ہوتا ہے جو اس عظیم موضوع کے ساتھ انصاف کرنے میں اُن کا ساتھ دیتی ہے۔ منتخب دوہوں[۴] سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے:

یہ شاہی اُس شخص کی شاہی جس کا بخت نصیر
جس کا احمد نام ہوا جو عادل شاہ فقیر

☆

عادل کرسی آنی جانی دھوپ چھاؤں کا کھیل
بس اک کھاٹ فقیری والی اونچ نیچ کا میل

عادل چھوڑ سنگھاسن اونچا بیٹھ فقیر کے ساتھ
جو جیتا ہے دے کر سب کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ

بن کرسی بھی اک حاکم نے عادل کئے کمال
احمد اور محمد ہے وہ اس کا عدل مثال

☆

عادل بیچ نہ جان ہمیں گر ہاتھ کبھی پھیلائیں
مانگنا تو اک عادت ٹھہرا ناں مانگیں مر جائیں

ناں مانگیں تو پھر داتا کی کیسے ہو پہچان
کہیں تو جھکنا پڑ جاتا ہے ٹھہرے جو انسان

ہم ہیں فقیر مگر رکھتے ہیں اپنی سی اک ساکھ
اپنی نظر میں ایک ہیں سارے ہیرا موتی راکھ

☆

عادل وہ کیا عدل کہ جس میں لمبے برس لگ جائیں
ملزم عدل کٹہرے اندر کھڑے کڑھیں کُرلائیں

عدل کٹہرے کے یہ باسی سب نادان فقیر
تیرے قلم کی نوک پہ ٹھہرا پل ان کی تقدیر

ان کی بپتاؤں میں قرآں، گیتا وید انجیل
کان ہی تیرے بند رہیں تو کس کو کریں وکیل

☆

عادل عدل کے یخ چہرے پر پیار کا چھینٹا مار
پیار کی گرمی میں بہہ جائیں نفرت کے کہسار

پیار میں خوشبو پیار میں خوشیاں پیار دِرَم دینار
غیروں کو بھی اپنا بنائے پیار بڑا جی دار

پیار کی گرمی پھول کھلائے پیار گل و گلزار
پیار خزانہ پیار دفینہ پیار کے روپ ہزار

☆

سارے طالب عدل کے رہ گئے خالی ہات
عادل تو نے بانٹ دی اپنوں میں سوغات
عادل بھید اس بات کا جان سکا نہ کوئے
بہتی دولت عدل کی بانٹے کم کب ہوئے
اوروں کے دکھ دیکھتا کھڑا رہا دلگیر
کیا رکھتا کیا بانٹتا خالی ہاتھ فقیر

اس حوالے سے دیکھا جائے تو نظم اور غزل کی طرح دوہے میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے اور اسلوب و موضوع دونوں اعتبار سے اسے توانائی بخشی ہے۔ یوں عادل فقیر خود بھی "پاکستان میں اردو دوہا کا ارتقاء" کی تاریخ میں سنہری حروف سے زندہ رہے گا۔

حوالہ جات

۱- نین جزیرے از رشید قیصرانی، اساطیر لاہور، ۱۹۹۶ء

۲- تبصرہ کملی میں بارات از عرش صدیقی: ڈاکٹر توصیف تبسم، ریڈیو پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۳- اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر از عاصی کرنالی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (غیر مطبوعہ)

۴- کملی میں بارات از عرش صدیقی مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۶۰ - ۱۰۳

انکساری مرا ایماں ہے، مرا دین ہے یہ
اِس کو اُس عظمتِ افکار کا روزن سمجھو
جو مری ذات میں ہے!

عرش صدیقی

نقد و نظر میں شعور کا داعی

تنقید

عرش صدیقی کے تخلیقِ فن کی تین جہات ہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید --- ان تینوں میں وہ ایک الگ پہچان اور انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ شاعری کرنے اور کہانی لکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک تنقید نگار کا منصب بھی پوری طرح ادا کیا ہے اور مغربی زبانوں کے مطالعے اور خاص طور پر انگریزی ادب کے استاد ہونے کے ناتے ان کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ فن پارے کی تفہیم کے لئے مشرق و مغرب دونوں رویوں اور رجحانات سے کام لیتے ہیں اور پورے عالمی ادب کی تحریکوں سے واقف ہیں چنانچہ ان کی تنقید بھی ان کی شاعری اور افسانے کی طرح توانا ہے اور اس میں بھی ان کا پھیلاؤ موجود ہے اور وہ تفصیل سے لکھنے کی طرف مائل ہیں۔

شاعری اور افسانے کی طرح تنقید کے حوالے سے بھی ان کے اپنے نظریات اور اپنی ایک الگ سوچ ہے اور تنقیدی مضامین میں بھی شعور کی کارفرمائی پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے اور وہ فن اور فن کار دونوں کا ہر سطح پر تفصیلی مطالعے کے عادی ہیں اور بعض اوقات یہ مقدمے اصل مسودے سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ عرش صدیقی کی تنقیدی تحریروں کی تفصیل جن میں دیباچے، مقدمے، پیش لفظ اور فلیپ شامل ہیں اور ان کے تنقیدی مضامین اور ادبی مسائل پر مباحث وغیرہ کی پوری تفصیل ان کے توقیت نامے میں الگ الگ عنوانات کے ساتھ درج کردی گئی ہے اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تحریروں میں وہ بے حد سنجیدہ نظر آتے ہیں اور ماہر کیمرہ مین کی طرح وہ ہر پہلو سے فن پارے کا تجزیہ کرتے ہیں اس میں کہیں کہیں حوصلہ افزائی کا رجحان بھی موجود ہے تاہم

انہوں نے اپنی حد سے تجاوز نہیں کیا اور نہ ہی اپنی کسی تحریر کو ڈس اون کیا ہے۔ عرش صدیقی کے تنقیدی مضامین کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین متعلقہ حوالوں سے مرتب کتابوں میں شامل ہیں اور اپنی تنقیدی اُپج اور انفرادی تجزیے کی بنا پر کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ توقیت نامہ میں ان کتابوں کی تفصیل بھی درج کردی گئی ہے۔ عرش صدیقی کے تنقیدی مقالات کے دو مجموعے "تکوین" اور "محاکمات" منظرِعام پر آچکے ہیں اور ان میں جو مقالات شامل ہیں وہ اردو تنقید نگاری کو ایک نئی جہت دیتے ہیں۔ تکوین میں :

میرا نظریہء شعروادب، اردو اور اساطیرِ عالم، شعور، سائنسی شعور اور ہم، پاکستان میں اردو دوہا نگاری، تخلیقی عمل، کتاب کی اشاعتِ ثانی - کیوں، اردو افسانہ ۔ ترجیحات اور صورتِ حال (ایک مکالمہ)، ہائیکو اور ڈاکٹر محمد امین اور اردو کے لئے انگریزی کی ضرورت۔

محاکمات میں :

۱ - شاعری :

فیض کی شاعری میں رومانی عناصر، عارف عبدالمتین کی نعتیہ شاعری، وزیر آغا کی شاعری، انوار انجم کی شاعری، شاعری اور فیاض تحسین کی شاعری

۲ - افسانہ :

مرزا ادیب کی داستانیں، دنیائے آرزو، مرزا ادیب، داستان گو اور افسانہ نگار، ڈاکٹر سلیم اختر کی افسانہ نگاری، لطیف کاشمیری کی افسانہ نگاری

۳ - تنقید :

ڈاکٹر وزیر آغا تنقید اور نئی تنقید، عارف عبدالمتین بحیثیت نقاد، ڈاکٹر اے بی اشرف کا تنقیدی شعور، ڈاکٹر طاہر تونسوی بحیثیت نقاد

کتابوں میں ان مقالات کے علاوہ چند ایسے بھی ہیں جو ان کے تنقیدی نظریات اور تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں اور جن کے مطالعے سے ان کے نقد و نظر کا تعین کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں: یہ مقدمے، دیباچے اور فلیپ ہیں :

شوخیءِ تحریر، گل افشانیء گفتار	اقبال ساغر صدیقی
دھیان کی سیڑھیاں	اعزاز احمد آذر
ترسیل	محمد افسر ساجد
شاخِ زیتون	رفیق خاور جسکانی
تین جزیرے	رشید قیصرانی
عرفانِ غالب	سلطان صدیقی
نگاہ اور نقطے	ڈاکٹر سلیم اختر
حماقتیں میرے مقدر کی	صلاح الدین حیدر
ہمسفر بگولوں کا	طاہر تونسوی
امکانات	عارف عبدالمتین
ایک بوند پانی	مقبول عباس کاشر
حرفِ بے صدا	نوشابہ نرگس
سراب کے پھول	عذرا وحید

اس کے علاوہ قابلِ ذکر مضامین یہ ہیں : وجودیت ایک تعارف، میرا پسندیدہ فن کار ٹی ایس ایلیٹ، تاج سعید کی شعری کائنات، ڈاکٹر بشیر سیفی کی شاعری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا طرزِ نگارش، افسانوی ادب اور نیا آہنگ۔

مجموعی طور پر ان مضامین و مقالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عرش صدیقی تنقید میں بھی کشادہ دلی کے قائل ہیں اور وہ کسی طور پر بھی بے رحم نقاد نہیں ہیں بلکہ انہیں فن کار سے ہمدردی بھی ہے اور اس کی تحریروں سے دلچسپی بھی --- اور وہ ان میں سے ایسے زاویے تلاش کرتے ہیں جو فن کار کی تنقیدی بصیرت کو نمایاں کرتے ہیں اور یوں وہ ایک متوازن نقاد کا رول ادا کرتے ہیں۔ تاہم وہ اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ شعوری محرکات کی کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ عرش صدیقی کی تنقیدی تحریروں سے کچھ اقتباس --- تاکہ ان کے تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت ہو سکے۔

"فیض کی شاعری اور شخصیت کا ایک اور پہلو جو اُسے رومانی شاعروں کے زمرے میں شامل کرتا ہے اس کا احساس تنہائی ہے جو جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔ اس کا بڑا سبب وہی خود مرکزیت کا رجحان ہے جو رومانی شاعری کا خاصہ ہے جو فیض کے ہاں بھی بڑی حد تک موجود ہے"۔

☆

"عارف کی نعت اپنے لہجے اسلوب اور مضامین کے اعتبار سے ارفع تر مقام کی حامل ہے اور ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔ "بے مثال" کی اشاعت نے جدید نعت کی وسعتوں کے نئے آفاق ہم پر کھول دیئے ہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے باوقار اظہار کا اسلوب ہمیں سکھایا ہے"۔

☆

وزیر آغا کی نظموں میں بھی جو چیز ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ وہی پیکر تراشی اور علامت پسندی اور ناگوار ابہام سے بیزاری کی خوبیاں ہیں جو اس کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں"۔

"انوار انجم کی شاعری میں دُکھ ہی دُکھ ہے سہانے مستقبل کی روشنی کی کوئی کرن اس کے ہاں نظر نہیں آتی اور حد تو یہ ہے کہ اس کے ہاں مستقبل کے کسی خواب تک کا سراغ بھی نہیں ملتا"۔

......☆......

فیاض تحسین کی شاعری ہر پہلو سے ہر حوالے سے توانا اور اعلیٰ ہے کہ زندگی سے مربوط بھی ہے نغمہ کا حسن بھی رکھتی ہے اور اسلوب کی تازگی کی بھی حامل ہے اور ذہن پر گہرا اثر چھوڑتی ہے اور یاد رہتی ہے، ایک بار پڑھنے یا سننے کے بعد برسوں پیچھا کرتی ہے"۔

......☆......

"رفیق خاور جسکانی عجیب شخص تھا کہ اس پر مصیبتوں کے کیا کیا پہاڑ نہیں ٹوٹے لیکن وہ ہمیشہ متبسم رہا۔ اس کی شاعری کا بھی یہی کردار ہے، یہی حسن ہے۔ اس کی شاعری اس کی ذات کا سچا عکس پیش کرتی ہے اور یہ عکس جہاں دوسری حساس روحوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے وہاں اُنہیں ہلاکر بھی رکھ دیتا ہے"۔

......☆......

"تاج سعید کے نظم نگار، گیت نگار اور غزل گو ہونے کے باوجود اس نے سب سے زیادہ تخلیقی کام دوہے میں کیا ہے اور اس صنفِ شعر میں اس نے نہ صرف انفرادیت قائم کی ہے بلکہ اس میں کئی راہیں بھی تلاش کی ہیں"۔

......☆......

"رشید قیصرانی نے جو اردو غزل اور اردو دوہے کے ایک اعلیٰ شاعر ہیں اپنے اردو دوہوں میں سرائیک کے چند الفاظ خوبصورتی اور دانائی سے

داخل کئے ہیں مثال کے طور پر بیٹھک کے لئے اوتاک، انتظار کے لئے تانگھ، زادِ راہ کے لئے سمل اور تھل کے باسی کے لئے تھلوچڑ--"۔

☆

ڈاکٹر بشیر سیفی کی شاعری دم گھونٹ دینے والی اس فضا سے محفوظ ہے جو زلف و رخسار، چشم و ابرو کے بے کیف ذکر اور معاملہ بندی کی مکروہ اشارہ بازی سے پیدا ہوتی ہے۔ موضوعات کے لئے زمین سے آسمان تک اور افق سے افق تک کی زندگی ان کے سامنے ہے جس سے ایک طرح کی کشادگیء نظر اور تازگی ان کی شاعری میں منعکس نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ذاتی تجربے کو شاعرانہ احساس اور اظہار کی بنیاد بنایا ہے جب ایسا ہوتا ہے تو شاعری میں شگفتگی در آتی ہے"۔

اور اب تنقید اور نثر کی دیگر اصناف کے بارے میں اقتباسات دیکھئے:

"عارف کے نزدیک تنقید کی زبان کا حسن اس بات میں مضمر ہے کہ یہ زبان غیر مبہم واضح اور صاف ہو۔ خود عارف کی تنقیدی زبان معیار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ "امکانات" کی اشاعت سے اردو تنقید میں ایک جامع تنقیدی رویے کی بنیاد اُستوار ہوتی ہے، اور یہ توقع بجا طور پر کی جاسکتی ہے کہ یہی رویہ بالآخر مستقل تنقیدی رویہ قرار پانے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے"۔

☆

"ڈاکٹر طاہر تونسوی کی یہ تصنیف (ہمسفر بگولوں کا) اُردو کے ایک اہم نقاد اور افسانہ نگار کے فکری ارتقاء اور اس کے افکار کی بنیاد کو سمجھنے اور ان کے افکار کی روشنی میں آج کے انسان معاشرے اور عصر کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔ یہ تصنیف محبت اور عقیدت کا

ثمر ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ مصنف کی بالغ نظری اور اس کے اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت بھی ہے''۔

......☆......

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جس امتزاج کو استحکام دیا وہ سادہ اور عام فہم اور کلاسیکی ہے۔ وہ موضوع کو ایک نامیاتی کل میں دیکھتے ہیں۔ وحید قریشی، سلیم اختر، انور سدید، محمد علی صدیقی، طاہر تونسوی، شہزاد منظر اور دوسرے جدید نقادوں سے بھی فرمان فتح پوری کا امتزاجی اسلوب مختلف ہے۔ نمایاں ترین پہلو ان کے اسلوب میں بیان کی سادگی ہے اسی لئے ان کے ہاں کسی قسم کا اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے طرزِ نگارش کی سلاست کی وجہ سے ان کی گفتگو کی تفہیم آسان ہی نہیں بہت آسان ہے''۔

......☆......

''بحیثیت مجموعی محمد افسر ساجد کی خاکہ نگاری اور تنقید ایک صاحبِ شعور صاحبِ علم، مہذب، کشادہ دل، کشادہ نظر اور ہر لحاظ سے شائستہ شخصیت کی جلوہ گری کی بشارت دیتی ہے''۔

......☆......

''ڈاکٹر وزیر آغا اردو کے چند نقادوں میں شامل ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو نئی راہیں دکھائیں اور اس کی بنیادوں کا کھوج لگاکر انہیں مستحکم کیا اور ساتھ ہی تنقید کو ایک جدید اور اہم علم کے مرتبے تک پہنچانے میں درجہء کمال کام کیا''۔

......☆......

عارف عبدالمتین کے تنقیدی شعور اور بنیادی رویے کا ایک نمایاں پہلو

یہ ہے کہ وہ نکتہ چینی اور عیب جوئی کو اپنی تنقید کا حصہ نہیں بناتے، ان کی تنقید دراصل شاعر اور اس کے فن کی تفہیم اور تحسین کو اپنا مقصد قرار دیتی ہے، چنانچہ وہ انہی شعراء پر لکھتے رہے جن کے لئے واضح دلائل کے ساتھ وہ پسند اور ترجیح کے جذبات اپنے اندر رکھتے ہیں"۔

......☆......

"طاہر تونسوی افراد پر تنقید میں اپنے موضوع کی تفہیم کے لئے ایک بنیادی نکتہ تلاش کرتے ہیں اور موضوع کا مطالعہ اس نکتے کی وضاحت کرتا ہے۔ عام طور سے یہ نکتہ مضمون کا عنوان قرار پاتا ہے اور عنوان کو دیکھتے ہی قاری کی جتنی ایک خاص سمت میں رہنمائی ہو جاتی ہے --- ڈاکٹر طاہر تونسوی کا عنوانات باندھنے کا انداز میراجی کے زیادہ قریب ہے مجموعی طور سے طاہر تونسوی آفاقی اور ابدی اقدار کے حوالے سے ادب، زندگی اور فن کار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں"۔

......☆......

مرزا ادیب اردو ادب کا وہ واحد فن کار ہے جس کے فن کے ارتقائی مدارج بڑی حد تک اردو کے پورے افسانوی ادب کے ارتقائی مدارج کی نشاندہی کرتے ہیں --- اب ہم جو کچھ سیکھ رہے ہیں وہ انگریزی کے ذریعے ہم تک پہنچ رہا ہے اور اسی مطالعے نے مرزا کو افسانے کی نئی ساخت سے آشنا کیا ہے، اسے نئے سانچے دیئے ہیں اور اس کی راہوارِ تخیل کو کھڑا ہونے کے لئے انفرادی اسلوب کی زمین عطا کی ہے"۔

......☆......

"حجرۂ ہفت بلد" میں ڈاکٹر سلیم اختر کے اہم ترین سات افسانے بلکہ اہم ترین افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے۔ ان افسانوں میں جو موضوعات ہیں ان میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور خود

افسانہ نگار کے ذہن سے بہت سی دھند چھٹ گئی ہے، اس کا ذہن کشادہ ہوگیا ہے اور اس کی نظریں اب انسان کی پوری نفسیات اور معاشرت پر محیط ہیں۔ بیانیہ انداز کی جگہ داستانی فضا میں علامتی اسلوب نے لی ہے معانی میں تہہ داریت کا اضافہ ہوا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں بڑے افسانے ہمارے ہاں کسی افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتے"۔

......☆......

"لطیف کاشمیری کے یہ افسانے اس لحاظ سے بھی بلاشبہ اہم ہیں کہ ان میں رومانی اور ترقی پسند نظریات مصنف کی ذات کا ایک ساتھ حصہ بن کر تخلیق میں ظاہر ہوئے ہیں ان افسانوں کو اردو افسانے کی ایک ارفع روایت میں نمایاں مقام حاصل ہے"۔

......☆......

"ڈاکٹر محمد امین جس توجہ اور جس لگن سے ہائیکو کی ترویج اور اس کے ارتقاء کی نگرانی کی ذمہ داری نبھارہے ہیں اس کی روشنی میں انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اُنہیں ان کا حق دیا جائے اور انہیں پاکستان میں ہائیکو کا امام تسلیم کیا جائے"۔

......☆......

"اقبال ساغر صدیقی کے مضامین کی بنیاد سیاسی اور سماجی شعور، انسانی رشتوں، اجتماعی نفسیات کے احساس اور زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کی ضرورت کی اہمیت پر قائم ہے وہ انفرادی نفسیاتی الجھنوں یا عارضوں کو موضوع بنانے کے بجائے اجتماعی مسئلوں، اجتماعی الجھنوں اور اجتماعی عارضوں پر لکھتے ہیں، لیکن ان کی تحریریں ادق مقالات نہیں ہوتے بلکہ طنز و مزاح سے پُر، خوشگوار، دلچسپ اور ہلکے پھلکے مضامین ہوتے ہیں"۔

"صلاح الدین حیدر بات سے بات نکالنے میں ماہر ہے وہ ایک موضوع پر بات کرتا ہے تو پھر اور کئی موضوعات یا باتوں کا احاطہ کرتا چلا جاتا ہے"۔

عرش صدیقی کے ان تنقیدی مقالات کے اقتباسات سے جو تنقیدی، تحقیق، شاعری، افسانہ، داستان، ہائیکو اور انشائیہ کے بارے میں ہیں یقینی طور پر عرش صدیقی کے تنقیدی نظریات اور عمیق مطالعے اور مغربی تنقید کے اثرات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے اور یہ بھی کہ عرش صدیقی ان فن پاروں کو جانچنے کے لئے کوئی مخصوص سانچہ استعمال نہیں کرتے اور فن پارے کی مناسبت سے وہ مختلف مکاتبِ فکر کے تنقیدی سانچے استعمال میں لاتے ہیں۔ تاہم ترقی پسند نقاد ہونے کے ناتے ان کے ہاں ترقی پسندانہ رویہ زیادہ کارفرما نظر آتا ہے اور وہ نفسیات اور عمرانیات کے اصولوں کو کام میں لاتے ہوئے تعصب سے بالا تر ہوکر تنقید کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں، اور وہ مختصر نویسی کے قائل نہیں بلکہ تفصیل سے بھی آگے کی منزل تک جانے کے عادی ہیں، اور یوں وہ فن اور فن کار دونوں کو کھنگال کر رکھ دیتے ہیں۔ میرے بارے میں جب ان کا ایک طویل مضمون (لمحہء موجود - ادب اور ادیب کا دیباچہ) فنون میں شائع ہوا تو اسے بہت پسند کیا گیا۔ معروف شاعر صفدر سلیم سیال نے جھنگ سے لکھا:

"تازہ فنون میں آپ کے بارے میں جناب عرش صدیقی کا مضمون پڑھا ہے بہت جی خوش ہوا ہے بہت ہی تازہ بلکہ تروتازہ مضمون ہے"۔ (خط بنام طاہر تونسوی، جھنگ صدر، ۷۔ اپریل ۱۹۹۲ء)

عرش صدیقی کے یہ سارے مضامین دیباچے، مقدمے اور فلیپ پڑھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ تنقید میں بھی اعلیٰ درجے کے منصب پر فائز ہیں یہ الگ بات کہ وہ لمحہء موجود کی تنقید سے مطمئن نہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے انٹرویوز میں تنقید سے مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ تنقید کے ساتھ بہت سے لائق نقادوں نے میری امید کو وابستہ رکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا

نے اردو تنقید کو سب سے زیادہ توانا بنایا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی حوالے سے اردو تنقید کو بے حد وسعت دی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر انور سدید، انیس ناگی، جیلانی کامران، شہزاد منظر، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر طاہر تونسوی، محمد علی صدیقی نے مل کر جدید اردو تنقید کو احترام بخشا ہے"۔ (روزنامہ مساوات ، لاہور ۳۱۔ جنوری ۱۹۹۲ء - ملاقات : زاہد عباس سید)

اس تناظر میں دیکھا جائے تو عرش صدیقی ایک غیر جانب دار ناقد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور تنقید کے اس عہد زوال میں ان کی تنقیدی بصیرت کے پس منظر میں ان کی آراء پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور انہوں نے تجزیاتی تنقید کی جو بنیاد رکھی ہے اس میں ترقی پسند تنقید، نفسیاتی تنقید اور رومانی تنقید تینوں کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں اور اس طرح انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ وہ اردو تنقید میں بھی شعور کے سب سے بڑے داعی ہیں مگر لاشعور کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ اس پس منظر میں انہوں نے تنقید کو بھی ایک نئی روح بخشی ہے۔

پنجابی شاعری کا نیا اظہاریہ

عرش صدیقی کی پنجابی شاعری

عرش صدیقی کا بنیادی تعلق چونکہ گورداسپور اور لدھیانہ سے تھا اس لئے ان کی مادری زبان بھی پنجابی تھی، چنانچہ اُنہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شاعری کی اور جنوری ۱۹۹۱ء میں ''کالی رات دے گھنگرو'' کے نام سے ۸۰ صفحوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں نظمیں اور گیت شامل ہیں، جو ص ۱۷ تا ۴۹ (نظمیں) اور ص ۵۳ تا ۶۵ (گیت) پر محیط ہے۔ گویا صرف ۴۴ صفحات کی شاعری ہے جس میں ۱۵ نظمیں اور چھ گیت ہیں۔

اس مختصر سے مجموعے میں البتہ اپنی ماں بولی میں بھرپور اظہار ملتا ہے، اور انہوں نے اپنی ثقافت، کلچر اور لوک رنگوں کے حوالے سے شاعری کی ہے، خاص طور پر نظموں میں ان کا ایک اپنا اسلوب اور موضوعات کا ایک الگ انداز ہے یوں ان کے ہاں ہر طرح سے تنوع نظر آتا ہے جو روایتی پنجابی شاعری سے یکسر مختلف بھی ہے اور منفرد بھی، اور ان کے پس منظر میں ان کی اردو شاعری کا پس منظر صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ''محبت لفظ تھا میرا'' میں انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں جو مضمون لکھا تھا اس کا پنجابی ترجمہ از حنیف چوہدری اس کتاب کے تتمے کے طور پر موجود ہے جس پر اردو شاعری کے تجزیاتی مطالعے کے ضمن میں گفتگو کی جا چکی ہے، البتہ پہلی بات میں عرش صدیقی نے عشق اور محبت کے جذبات اور ان پر شعور کی بالادستی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے نظریہ شعور کو تقویت دی ہے۔ اس بیانیے میں انہوں نے خاص طور پر لفظوں کے درتارے کے بارے میں گفتگو کرتے

ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے پنجابی زبان کے خاص محاورے، لفظ اور ان کے ماحول کو پیشِ نظر رکھا ہے اور ایسے لفظوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی اس بات سے بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ان کی پنجابی شاعری ان کی اردو شاعری سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی پنجابی شاعری کا جواز بھی پیش کیا ہے۔ چند مثالیں دیکھیئے :

نیندر لئی اے رات بنائی
ساری دنیا سَونویں
بس ایک میریاں اکھاں دے بوہے تے
پچھلیاں ورہیاں وِچ گواچا
اک چٹا پل،
اک سوہنا پل،
پہرے داراں وانگ کھلوتا
اُچیاں واجاں لاوے
مینوں نیند نہ آوے
کالی رات دے کالے گُنگرو
وجّن - سون نہ دین ! (کالی رات دے گھنگرو)

اِس نظم میں ڈر، خوف اور بے خوابی کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اور اس میں جس طرح ماضی کی یادوں سے اپنا رشتہ جوڑا گیا ہے اور یادوں کے اُن سایوں کے جو جس طرح کالی رات میں بجنے والے گھنگروں سے تشبیہ دی گئی ہے وہ ان کے تخلیقی اظہار اور کمالِ ہنر کا منہ بولتا ثبوت ہے اور پھر تلاش و جستجو کا جو عمل زندگی بھر جاری رہتا ہے اس کا احساس ان کی نظم ''اونئیں ملیا'' میں موجود ہے دیکھیں :

ادھا رستہ مینوں لگا
پورے رستے توں وی لما
اُتر، دکھن، پچھم پورب

اَگےّ پِچھےّ سجے کھبےّ
ٹلےّ ٹبےّ، ٹوئے، کھوبے
ہر تھاں لبھیا
چک چک اڈیاں
ہر تھاں لبھیا
او نئیں ملیا!

درد و فراق اور جدائی کی ان کیفیات کا عکس اُن کی دوسری نظموں میں بھی موجود ہے اور یہ ایک مسلسل عمل ہے جس نے ان کے شعور و آگہی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات ان کی نظموں ''جھلا'' - ''پت جھڑ آیا''- ''میرا چانن واپس کردے'' اور ''لمّی رات دی سوچ'' میں موجود ہیں۔

گویا ان کی ساری نظمیں انسان کے کرب باطنی دُکھ، زندگی اور اس کے مسائل، حیاتِ مستعار میں پیش آنے والے لحظہ لحظہ بدلتے حالات، معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ، سماجی رویوں میں مفادات کا سیلِ رواں، بستی میں بسنے والے لوگوں کے درمیان مصلحتوں کے پیدا کردہ فاصلے اور آدمی سے آدمی کی دوری جیسے مضامین کا بھرپور اظہاریہ ہیں اس تناظر میں ان کے ہاں ذات کا حوالہ اجتماعی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہی کیفیت ان کے گیتوں میں بھی برقرار ہے اور ان میں پنجاب کی روایات و ثقافت کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کہیں کہیں اردو نظموں کے خیالات کی رَو غیرشعوری طور پر نظر آتی ہے، تاہم ان نظموں میں شاعر کے بنیادی نظریات اور خیالات سے کہیں پر تضاد دکھائی نہیں دیتا، بلکہ پنجابی شاعری میں بھی عرش صدیقی کی اپنی ذات کا عکس نمایاں طور پر جلوہ ریز ہے۔ اس تناظر میں یہ مجموعہ ''کالی رت دے گھنگرو'' پنجابی شاعری کی جدید روایت کو جنم دیتا ہے اور ایک انفرادی شان کے ساتھ اس میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

دنیائے ادب کا عرش

محاکمہ

عرش صدیقی کا شمار پاکستان کے ادبی معماروں میں ہوتا ہے جہاں انہوں نے اپنی تخلیقات سے ادبی دنیا کو متاثر کیا اور اپنی تخلیقی فعالیت کے لئے نئے نئے راستے اور نئی راہیں نکالیں۔ شاعری، افسانہ اور تنقید تینوں میں نہ صرف انفرادی شان پیدا کی بلکہ ان میں نئے جہانوں کا سراغ لگا کر انہیں ایک نئی معنویت سے روشناس کرایا۔ گذشتہ اوراق میں ان کی تخلیقی جہتوں کے بارے میں جائزہ لیا جاچکا ہے تاہم یہاں یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ عرش صدیقی نے اپنے تخلیقی سفر میں نوجوانوں اور نئی نسل کو ساتھ رکھا اور ہر اعتبار سے ان کی ادبی تربیت کی اور ان کے ذوق کو نکھارا۔ ہر مقام پر ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں حسن، خیر اور صداقت کا متلاشی بنایا اور یوں ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جو لمحہء موجود میں ادبی دنیا میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوارہی ہے اور اس کا کریڈیٹ یقینی طور پر عرش صدیقی کو جاتا ہے۔

عرش صدیقی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کیا، اور غزل سے نظم کی طرف ائے اور ”دیدۂ یعقوب“ سے ”محبت لفظ تھا میرا“ اور ”اُسے کہنا دسمبر آگیا ہے“ تک ان کے ہاں ایک تدریجی اور تاریخی ارتقاء نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اُنہوں نے بہت کم لکھا ہے۔ اور بہت کم کہا ہے مگر ڈٹ کر کہا ہے۔ اور اس میں ہر اعتبار سے موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر انفرادیت پیدا کی ہے۔ پرویز مجتبیٰ حسین نے ان کی ”محبت لفظ تھا میرا“ کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عرش صدیقی نے کچھ اپنے اور اپنی شاعری کے بارے میں جس طرح نفسِ شاعری، شاعری کے تقاضوں، عصری آگہی اور شاعر کی ذمہ داریوں، لفظ و معنی اور ہئیت کے رشتوں سے بحث کی ہے وہ خود اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے اور بہت فکرانگیز ہے۔ عرش صدیقی کی شاعری بھی کم فکر انگیز نہیں ہے۔ شاعری بھی ہے گھلاوٹ بھی ہے ماضی حال اور مستقبل بھی ہے اور ایک رومانی لے بھی ہے۔ ان کی نظم "اُسے کہنا" میں یہ سب چیزیں ایک جا پائی جاتی ہیں۔ یہ نظم کتنی زاویہ ساز نظم ہے۔ جدائی قربت، موت، زندگی، وقت، محبت، ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ اس مختصر نظم میں ہے۔ عرش صدیقی کی یہی حیات پیمائی ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ "محبت لفظ تھا میرا" پڑھنے، سوچنے اور سمجھنے کی چیز ہے"۔[۱]

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی نے درست لکھا ہے کہ:

"عرش صدیقی بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے اور نصف صدی کی ریاضت نے اس کی نظم کو رفعت اور نکھار بخشا ہے"۔[۲]

ڈاکٹر محمد امین نے اپنے مضمون "نظریہ شاعری اور عرش صدیقی" میں ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے درست نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"عرش صدیقی ہمیں سب سے الگ کھڑے نظر آتے ہیں انھوں نے توازن کو برقرار رکھا۔ نہ وزن اور بحر کو چھوڑا اور نہ ہی جدت طرازی میں نئی لسانی تشکیل کی۔ نعرۂ احتجاج بھی بلند نہیں کیا۔ اپنے خیالات کو وضاحت کے ساتھ مروجہ محاورے میں مقبول اور رواں آہنگ میں پیش کیا۔ ذات کے سمندر میں غوطے لگانے کی بجائے محبت کو اعلیٰ انسانی قدر کے طور پر پیش کیا۔ وہ محبت جو انسانی، فطری ہے اور شعور و عقل کے تابع ہے انھوں نے اپنے گردوپیش پر جو

نظر ڈالی ہے تو اس کا عقلی تجزیہ کیا ہے''۔[۳]

عرش صدیقی نے شاعری کے ساتھ ساتھ کہانی بھی لکھنا شروع کی اس اثنا میں انہوں نے مرزا ادیب کے بہترین افسانے بھی مرتب کئے اور امیر علی کی سرگذشت کے نام سے اس مشہور ٹھگ کی داستان کا ترجمہ بھی کیا۔ اسے شاہین مطبوعات ۸۔ پنج محل روڈ، لاہور نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا اور اس پر اخبارات و رسائل میں تبصرے بھی شائع ہوئے جو یہ ہیں:

روزنامہ ملت، لاہور، سنڈے ایڈیشن، مورخہ ۲۱۔ فروری ۱۹۵۵ء

روزنامہ امروز، لاہور، سنڈے ایڈیشن، ۲۱۔ فروری ۱۹۵۵ء

ہفت روزہ قندیل، لاہور، ۲۰۔ مارچ ۱۹۵۵ء

روزنامہ ہلالِ پاکستان، لاہور، ۲۸۔ فروری ۱۹۵۵ء

روزنامہ احسان، لاہور، ۵۔ مارچ ۱۹۵۵ء

اس کتاب کو کراچی کے ایک ڈائجسٹ ''چودھویں صدی'' نے جس کے مدیر طارق عزیز تھے قسط وار شائع کیا اور اسے قارئین نے بہت پسند کیا۔ آخری دنوں میں وہ اسے دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور لاہور کے ایک پبلشر نے ہامی بھی بھرلی تھی مگر وہ مسودہ کیا ہوا اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ بہرحال یہ بھی عرش صدیقی کا ایک کارنامہ ہے۔ ذکر عرش صدیقی کی کہانیوں کا شروع ہوا تھا تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عرش صدیقی نے محض سولہ کہانیوں کے بل بوتے پر افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنایا اس سلسلے میں منظر امکانی کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ اس بات کو تقویت پہنچانے کے لئے چند اور آراء دیکھئے:

''عرش صدیقی کے موضوع بالکل نئے نہیں لیکن انہوں نے جس موضوع کو چھوا ہے اُسے نیا اور عظیم بنادیا ہے''۔[۴] (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

☆

''عرش صدیقی کی افسانہ نگاری جدید اردو افسانے کی اس آبرو کے

تحفظ کی بشارت قرار پاتی ہے جس کو آج اپنے لٹنے کا شدید خطرہ درپیش ہے"۔[۵] (عارف عبدالمتین)

☆

"عرش صدیقی حقیقت نگاری کی روایت سے وابستہ ہے اور اس کا فن تفصیل نگاری کا فن ہے ..... عرش صدیقی نے کرداروں کے باطن سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی جہت در جہت جذباتی کیفیات کی عکاسی اس ماہرانہ انداز اور نئی تکنیک سے کی ہے کہ خود قاری بھی کرداروں کے ساتھ نفسی ہفت خواں طے کرتا جاتا ہے اور اسی میں عرش صدیقی کی انفرادیت کا راز مضمر ہے"۔[۶] (ڈاکٹر سلیم اختر)

☆

عرش صدیقی نے ہمیں تعداد میں بہت کم افسانے دیئے ہیں لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ یہ تمام افسانے اردو ادب کے اعلیٰ ترین افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں"۔[۷] (ڈاکٹر اے بی اشرف)

☆

"شاعر کی نسبت وہ افسانہ نگار زیادہ بڑا ہے گو اس نے ایک دو لافانی نظمیں تحریر کی ہیں۔ افسانے کی زبان خوبصورت ہوتی ہے مجھے اس کا افسانہ "کتے" اور "باہر کفن سے پاؤں" بہت پسند ہیں۔ "باہر کفن سے پاؤں" کی فضا لاثانی ہے اور "کتے" کے موضوع کا ٹریٹ منٹ نہایت ہی منفرد ہے۔ ایسے افسانے اردو میں بہت کم ملتے ہیں"۔[۸] (جابر علی سید)

☆

"باہر کفن سے پاؤں" بلاشبہ عرش صدیقی کا ہی نہیں اردو کا ایک اہم افسانہ ہے اس میں دو نسلوں کے رویے کو بڑی خوبصورتی سے پیش

کیا گیا ہے ایک نسل جو زندگی کے ہر امکان کی حفاظت کرتی ہے اور دوسری نسل جو اپنی مصروف زندگی میں سے ایک اکتایا ہوا لمحہ نکال کر آخری رسوم میں شرکت کرتی ہے چاہے مرنے والا ابھی زندہ ہو۔ دوسرے اس میں ایک انسان دوست کی یوٹوپیا بڑی خوبصورتی سے اُبھر کر سامنے آتی ہے"۔[9] (ڈاکٹر انوار احمد)

"۱۹۷۸ء کا افسانہ" کے عنوان سے امروز لاہور میں، مَیں نے جو جائزہ لکھا تھا اس میں کہا تھا کہ :

"عرش صدیقی کے یہ افسانے حقیقت نگاری کا مرقع ہیں افسانہ نگار نے کرداروں کی جذباتی کیفیات کی عکاسی اس ماہرانہ انداز سے کی ہے کہ قاری اپنے آپ کو افسانے کا کردار سمجھنے لگ جاتا ہے۔ ان افسانوں میں موضوع کے حوالے سے ہی نہیں ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے بھی نئے تجربے کئے گئے ہیں، طبقاتی شعور، اقتصادی مسائل جذباتی ناآسودگی اور نفسیاتی عوامل کے پس منظر میں لکھے گئے یہ افسانے اردو افسانے کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کرتے ہیں اس طرح ۱۹۷۸ء کی نبضیں ڈوبنے سے پہلے عرش صدیقی کے اس مجموعے نے نیا روپ دکھایا ہے"۔

......☆......

ستار طاہر نے "باہر کفن سے پاؤں" کے بارے میں لکھا ہے :

"عرش صدیقی بے حد منفرد افسانہ نگار ہیں۔ "باہر کفن سے پاؤں" اردو زبان میں ایک بہت بڑا تجربہ ہے۔ یہ افسانہ ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا موضوع اور اس کی پیش کش اردو افسانے میں بالکل نئی چیز ہے۔ عرش صدیقی کے اس افسانوی مجموعے کو پڑھ کر یہ شدید اور خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ یہ افسانے اردو افسانے میں بہت ممتاز اور منفرد احساس اور تجربات کے حامل ہیں۔ ان

افسانوں نے (فرشتہ) کے علاوہ افسانے کے فن میں نئی جہات اور امکانات و عملی طور پر پیش کیا ہے"۔[۱۰] (تخلیق کہانی نمبر ۱۹۸۴ء)

......☆......

ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

"عرش صاحب کی مصروفیات نے انہیں موقع نہیں دیا کہ وہ افسانہ نگاری جاری رکھتے بہرحال انہوں نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں صف اول کے افسانہ نگاروں کے ہم پلہ ہیں"۔ (خط بنام طاہر تونسوی ۱۲۔ اپریل ۱۹۸۹ء)

معتبر افسانہ نگار انور عنایت اللہ نے عرش صدیقی کے افسانے "باہر کفن سے پاؤں" کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے اور اس مجموعے کی دیگر کہانیوں کو بھی سراہا ہے۔ ان کے بقول :

"باہر کفن سے پاؤں" میں شامل ہر کہانی کئی پہلوؤں سے غیر معمولی ہے۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے یہ کہانیاں ان تمام کہانیوں سے مختلف ہیں جو اردو میں لکھی جاچکی ہیں یا اب لکھی جارہی ہیں۔ وہ اردو کے جدید پاکستانی افسانہ نگاروں مثلاً انور سجاد وغیرہ کی تجریدی کہانیوں سے بھی مختلف ہیں۔ اس بات کی شہادت "باہر کفن سے پاؤں" کے اس انگریزی ترجمے سے واضح ہے جو میں نے کیا ہے --- بعض جگہوں پر مصنف کی تکنیک اور زندگی کے بارے میں رویہ کافکا اور جیمز جائس ایسے مصنفوں سے ملتا ہے۔ تمام علامتیں نہایت معنیٰ آفرینی کے انداز میں استعمال ہوئی ہیں جو "باہر کفن سے پاؤں" کو اتنا بڑا اور غیر معمولی افسانہ بنادیتی ہیں جتنا منٹو یا کرشن کا کوئی بہترین افسانہ ہو سکتا ہے"۔ (ہیرلڈ کراچی دسمبر ۱۹۷۹ء)

عرش صدیقی نے شاعری اور افسانہ نگاری میں جو کمال دکھایا ہے اور جس

طرح اربابِ فن سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور بقول ڈاکٹر محمد اجمل نیازی :

"ملتان کا نام آئے تو صرف ایک شخص کا نام لبوں پر تھرکتا ہے اور وہ عرش صدیقی ہیں وہ یقیناً لمحۂ موجود میں ملتان کے سب سے بڑے آدمی ہیں"۔

(بے نیازیاں، روزنامہ پاکستان، لاہور، ۲۳۔ مئی ۱۹۹۶ء)

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں وہ ہر لحاظ سے بڑے آدمی تھے اور انہوں نے اردو تنقید کو بھی جلا بخشی اور شعوری محرکات کے حوالے سے اس میں ایک نئی روح پھونکی۔ ان کے لکھے ہوئے دیباچے، مقدمے، پیش لفظ اور فلیپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں، چنانچہ عرش صدیقی کی تخلیقی شخصیت شاعری، افسانہ اور تنقید کی مثلث سے بنتی ہے اور اس مثلث کے تینوں زاویے توانائی کا تربیلا ڈیم ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے انہیں خراج پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :

"عرش صدیقی کے اظہار کے تین زاویے یعنی شاعری، افسانہ اور تنقید --- مختلف سمتوں سے پھوٹے ہیں اور ان کی تخلیقی شخصیت میں یوں مدغم ہوگئے ہیں کہ عرش صدیقی کی پوری شخصیت ان سب کے بیک وقت مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں انہیں محمد حسن عسکری کی طرح صرف آٹھ افسانوں کے بل بوتے پر زندۂ جاوید ہوجانے والا افسانہ نگار شمار نہیں کرتا۔ محمد حسن عسکری نے زندگی کے مختلف ادوار میں اظہار کی نئی نئی اصناف کو آزمایا اور سابقہ صنف کو مطلقہ بیوی کی طرح نظرانداز کردیا۔ چنانچہ ہر صنفِ ادب عسکری کی ادبی شخصیت کے الگ الگ گوشوں سے متعارف کراتی ہے اور ان کے درمیان واضح حدِامتیاز موجود ہے۔ عرش صدیقی کے ہاں یہ حدِ فاصل نظر نہیں آتی۔ ان کی شاعری، تنقید اور افسانہ میں جو قدرِ مشترک نمایاں ہے وہ عرش صدیقی نہیں بلکہ وہ فکری عنصر ہے جسے عامتہ الناس تک پہنچانے کے لئے عرش صدیقی نے اظہار کے مختلف اسالیب اور مختلف اصناف کا سہارا لیا ہے۔

چنانچہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ عرش صدیقی بطور افسانہ نگار کامیاب ہیں یا بطور شاعر اور افسانہ نگاری میں ان کا مرتبہ بلند ہے یا تنقید میں تو شاید کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ عرش صدیقی نے اپنی تخلیقی شخصیت کو غیر ضروری تجربوں میں لخت لخت ہونے سے بچایا ہے۔ عرش صدیقی نے ان تینوں اصنافِ ادب سے اپنی ادبی شخصیت کا "مدون گل" مرتب کیا ہے"۔" (سیپ کراچی شمارہ ۴۱، ۱۹۸۰ء)

غرض یہ کہ عرش صدیقی نے زندگی اور اس سے پیدا شدہ امکانات کو اپنی حیاتِ مستعار میں پوری دیانت داری، جانفشانی اور عقل و شعور کی بالادستی کے اعتبار سے مکمل اعتبار بخشا اور کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی قد و قامت اور ان کے خلوص و محبت کے عملی اظہار کے لئے بہت سے لکھنے والوں نے اپنی کتابوں کا انتساب ان کے نام کیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

پھٹا ہوا بادبان	عبدالرشید
بھولی بسری کہانیاں (یونان)	مرزا ابنِ حنیف
میر، غالب اور اقبال	ڈاکٹر اے بی اشرف
کہکشاں	خالد پرویز
اقبال شناسی کے زاویے	ڈاکٹر سلیم اختر
ہوا دی کفنی	ندیم اجمل عدیم
رجحانات	ڈاکٹر طاہر تونسوی

اسی طرح بہت سے شاعروں نے انہیں منظوم خراج بھی پیش کیا جن میں سید اصغر علی شاہ اور سید نزدوش ترابی قابلِ ذکر ہیں۔ اصغر علی شاہ کی نظم "عرش و فرش" کے چند اشعار دیکھئے:

فرہنگ میں سے صرف محبت تھا جس کا لفظ
وہ دوستوں کو چاہنے والا نہیں رہا

جس شخص نے شعور کو تحت الشعور سے
کن خوبیوں سے کھینچ نکالا نہیں رہا

جو آدمی نکالے تھا باہر کفن سے پاؤں
گریاں ہر اک تھا پاؤں کا چھالا نہیں رہا

تحقیق و نقد پر تو کتابیں بہت پڑھیں
پر بہترین تھا جو مقالہ نہیں رہا

نظم و غزل، فسانہ و تحقیق و انتقاد
ہر ایک فن میں تھا جو نرالا نہیں رہا

(نوائے وقت ملتان: ۱۰۔جون ۱۹۹۷ء)

سید نردوش ترابی کا اظہارِ خیال دیکھئے:

جناب عرش کے ایسے نقوش تیکھے ہیں
کہ شہرِ حسن نے انداز ان سے سیکھے ہیں

یہ ان کا ہاتھ ہے یعنی قلم کی زینت ہے
مجھ ایسے بے سروساماں کو دستِ شفقت ہے

جمالِ شعر، فسانے کا آپ زیور ہیں
ہو بات نقدِ ادب کی تو آپ محور ہیں

نیا آہنگ ہے اور جدتِ ادا بھی ہے
جو حرف آپ نے لکھا وہ گونجتا بھی ہے

مثالِ دیدۂ یعقوب غم شناس ہیں آپ
ہمارے شعر کی بنیاد اور اساس ہیں آپ

ہوا کی موج کی تیزی نے مجھ کو گھیرا تھا
جناب عرش محبت ہی لفظ میرا تھا

انا قلم کی ہے جگ میں یہ ہاتھ جیتا رہے
جنابِ عرش کا سب سنگ ساتھ جیتا رہے

یہ دعائیہ نظم اپنے مندرجات کی بناء پر لافانی رہے گی اور ہمیشہ عرش صدیقی کی یاد دلاتی رہے گی۔ تبھی ڈاکٹر اجمل نیازی نے اپنے کالم "بے نیازیاں" میں عرش صدیقی کو ملتان کے عرش پر ٹوٹتا ہوا تارہ کہا تھا اور منو بھائی نے ان کے انتقال پر اپنے کالم "گریبان" میں تحریر کیا تھا کہ "میرا ملتان کمزور ہوگیا"۔

نامور ادیب، شاعر، مترجم اور عہد ساز شخصیت شوکت واسطی نے اپنے تعزیتی خط میں لکھا:

"مرحوم ایک صاحبِ نظر دانشور، نقاد اور طباع ادیب و شاعر تھے۔ مشفق و مہربان دوست کہ جن کا وجود فی زمانہ کمیاب ہے۔ یقیناً ان کی رحلت سے ادبی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔" (خط بنام طاہر تونسوی: ۲۶۔اپریل ۱۹۹۷ء)

ڈاکٹر سید معراج نیر استاد شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور نے لکھا:

"آج کے اخبار سے پروفیسر عرش صدیقی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر کتنا ملال ہؤا اس کا اندازہ یقیناً تم لگا سکتے ہو۔ یہ عالمِ فنا ہے اور یقیناً باری باری سب سدھاریں گے۔ جتنے گھر بستے بساتے ہیں اس سے زیادہ قبریں آباد ہوں گی۔ خلا پورے ہوتے رہیں گے لیکن عرش صدیقی کا انتقال ایسی موت ہے جس کا خلا مدتوں پورا نہیں ہوگا۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ تنقید، تحقیق، افسانہ نگاری اور شاعری کون سا فن تھا جو ان کا فن نہ ہو۔ پھر وہ ایک اچھے معلم بھی تھے جنہوں نے نہ صرف علم بلکہ فن کی روایت کو اپنے شاگردوں میں بھی منتقل کیا۔ ان کی ہمت افزائی کی اور ان کی راہوں کو متعیّن و معیّن کردیا۔ شاگرد بھی اولاد ہوتے ہیں اور اپنے محبوب اساتذہ کے علمی وارث۔ سو تم بھی ایک

مناسب ہستی ہو جس سے ان کی موت پر اظہارِ افسوس کیا جا سکتا ہے"۔
(خط بنام ظاہر تونسوی: ۹۔اپریل ۱۹۹۷ء)

عرش صدیقی اب ہم میں نہیں رہے اور ہم انہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتے

اسے کہنا کہ لوٹ آئے

اس لئے کہ " ہم اُسی کی طرف سے آئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ جائیں گے" پر ہمارا پختہ ایمان ہے اور یہ بھی کہ مرے ہوئے واپس نہیں آیا کرتے مگر عرش صدیقی تو صرف طبعی موت مرے ہیں۔ ان کا فن، ان کی شاعری، ان کا افسانہ، ان کی تنقید، ان کے دوہے، ان کی تقریریں، ان کی محبت، ان کی شفقتیں اور ان کا پیار زندہ ہے۔ جب تک یہ کائنات باقی ہے عرش صدیقی کبھی بھی نہیں مر سکتا۔ دنیائے ادب کا یہ عرش، فرش نشیں ہوتے ہوئے بھی عرش نشیں رہے گا۔

حوالہ جات

۱- تبصرہ "محبت لفظ تھا میرا" ، از پروفیسر مجتبیٰ حسین، نشریہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ، ۲۱۔ مارچ ۱۹۸۴ء

۲- "ادب آثار" از شمیم حیدر ترمذی، کاروانِ ادب ملتان، ۱۹۹۶ء ص ۱۶۱

۳- توجیہ از ڈاکٹر محمد امین ڈائیلاگ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۸، ص ۱۴۷

۴- پیش لفظ "عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے" از ڈاکٹر طاہر تونسوی

۵- ایضاً

۶- افسانہ اور افسانہ نگار - تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سلیم اختر

۷- ادب اور سماجی عمل از ڈاکٹر اے بی اشرف

۸- بحوالہ پیش لفظ: "عرش صدیقی کے ساتھ مسترد افسانے" از ڈاکٹر طاہر تونسوی

۹- تخلیق، کہانی نمبر ۱۹۸۴ء

۱۰- "اردو افسانے کی کروٹیں" از ڈاکٹر انور سدید، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء

نسب نامہ

شجرہ نسب عرش صدیقی (شجرۂ الیاس)

حضرت (عبداللہ) ابو بکر صدیقؓ (پیدائش ۵۷۲ء، مکہ - وفات ۲۲۔ اگست ۶۳۴ مدینہ)

↓

حضرت عبدالرحمٰن (وفات ۶۷۵ء، - ۵۸ھ)

↓

حضرت عبداللہ (حاکم یمن وفات بعد از ۷۰ھ)

↓

شیخ اسماعیل

↓

شیخ ابراہیم ابوالبرکات

↓

شیخ ابو بکر ثانی

↓

شیخ محمود

↓

شیخ احمد (حاکم یمن)

↓

شیخ حسام الدین

↓

شیخ شمس الدین خم یمنی (حاکم یمن)

↓

شیخ امام الدین

↓

شیخ کمال الدین محمد یمنی ثم سیستانی (حضرت زکریا ملتانی کے استاد)

↓

شیخ معین الدین

↓

شیخ علاؤ الدین

↓

شیخ فخر الدین الملقب بہ محی الدین

↓

شیخ نظام الدین

↓

قاضی شیخ حسام الدین (ثانی) (سیستان میں جحنبر کے قاضی)

↓

قاضی القضاۃ مولانا شیخ قوام الحق والدین صدیقی (یمنی، سیستانی، دہلوی، روہتکی قدس سرہٗ ۱۹۲۰ء سے پہلے روہتک میں سکونت اختیار کی)

↓

مولانا افتخار الدین (ان کے دیگر بھائی کبرالدین، رشیتہ الدین، عبدالوحید اور سلیمان تھے)

↓

عماد الدین (۱۲۸۷ء - ۶۸۶ھ میں معزالدین کیقباد نے انہیں قاضی، مفتی اور محتسب کے عہدے دیئے۔ آپ روہتک سے ''مہم'' جاکر آباد ہوئے)

↓

ہدایت اللہ (قاضی، مفتی، محتسب)

↓

قاضی محمد	(ان کے ایک بھائی محمد قادن تھے جن کی اولاد سے عرش کے نانا اور بیوی متعلق ہیں)
↓	
قاضی حامد	
↓	
قاضی مبارز الدین	
↓	
قاضی محمد اسحٰق	(١٥٧٣ء کی ایک تحریر میں آپ کے نام سے ساتھ مرحوم لکھا ہوا ہے۔ ''مآثرالاجداد'')
↓	
قاضی عبدالرحیم	(ان کے ایک بھائی قاضی احمد تھے)
↓	
شیخ عبدالصمد	(ان کا قاضی ہونا ثابت نہیں، نرخ نویس تھے اور جدّی نام کے طور پر قاضی لکھا کرتے تھے۔ بحوالہ مآثرالاجداد ص ١٧)
↓	
محمد سعید قاضی	(فروری ١٦٧٦ء تک متعدد تحریروں میں مہر موجود ہے)
↓	
قاضی محمد تقی	
↓	
قاضی فتح علی	
↓	
قاضی علی اکبر	(وفات ١١۔ اکتوبر ١٧٨٢ء - ١٤۔ ذیقعد ١١٩٧ھ)
↓	
شیخ احمد	(٨۔ نومبر ١٨٠٥ء کی تحریر بر دستخط موجود)

↓

حامد علی (۷۔ ستمبر ۱۸۲۹ء کی تحریر پر دستخط موجود۔
بحوالہ آثار الاجداد ص ۱۹۲)

↓

- **فضل الرحمٰن** (۱۸۲۰ - ۱۸۹۲ء)
  - **رشید الرحمٰن** ۱۸۵۵ - ۱۹۲۸ء
    - **بشیر الرحمٰن** ۱۸۹۶ - ۱۹۵۲ء
      - **ارشاد الرحمٰن عرش صدیقی** ۲۱-۱-۲۷
        - منزّہ (دختر) ۱۹۵۹ - ۱۹۶۴ء
        - جہاں زیب ۱۲-۱-۶۵ منگل
        - اورنگ زیب ۱۸-۱-۶۷ بدھ
        - احمد دانیال ۳-۳-۶۹ سوموار
        - جہاں تاب (دختر) ۱۱-۳-۷۳ اتوار
      - اعجاز الرحمٰن
      - حامد صغیر
      - محمود اختر
      - مظفر علی وفات ۱۹۳۶ء کانگڑہ
    - **حبیب الرحمٰن** ۱۸۹۳ - ۱۹۵۷ء
    - **ارشاد الرحمٰن** (بچپن میں فوت ہوئے)
  - **جمیل الرحمٰن** ۱۸۶۳ - ۱۹۲۴ء
    - **عزیز الرحمٰن**
      - ↓ مطیع الرحمٰن
    - **امین الرحمٰن**
      - عبدالرحمٰن ۱۹۲۵ء پیدائش
        - عرفان جمیل
        - رضوان جمیل
      - فضل الرحمٰن ۱۹۳۰ء پیدائش
        - جمیل
        - امین
        - انور

کوائف نامہ

نام .... ارشاد الرحمٰن صدیقی

قلمی نام ..... عرش صدیقی

ولدیت ...... بشیر الرحمٰن صدیقی

پیدائش ...... ۲۱۔ جنوری ۱۹۲۷ء گورداسپور (انڈیا)

تعلیم

میٹرک	۱۹۴۵ء	اسلامیہ ہائی سکول لدھیانہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور
ایف ایس سی	۱۹۴۷ء	گورنمنٹ کالج لدھیانہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور
بی اے	۱۹۴۹ء		پنجاب یونیورسٹی لاہور
ایم اے انگریزی	۱۹۵۵ء	گورنمنٹ کالج لاہور	پنجاب یونیورسٹی لاہور
ڈپلوما آف میرٹ	۱۹۸۲ء		پنجاب یونیورسٹی لاہور
کلچرل ڈاکٹریٹ (لٹریچر)	۱۹۹۱ء		ورلڈ یونیورسٹی اری زونا (یو ایس اے)

ملازمت

لیکچرر انگریزی	گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ	دسمبر ۱۹۵۵ء تا نومبر ۱۹۵۷ء
جونیئر لیکچرر انگریزی	گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول مظفر گڑھ	۱۵۔ نومبر ۱۹۵۷ء تا ستمبر ۱۹۵۹ء
لیکچرر انگریزی	گورنمنٹ انٹر کالج ملتان	ستمبر ۱۹۵۹ء تا دسمبر ۱۹۵۹ء
لیکچرر انگریزی	گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان	جنوری ۱۹۶۰ء تا ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۷۵
چیئرمین شعبہ انگریزی	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	یکم نومبر ۱۹۷۵ء تا ۱۵۔ جون ۱۹۷۸ء
رجسٹرار	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان	۱۶جون ۱۹۷۸ء تا ۲۰جنوری ۱۹۹۰ء

اعزازات و ایوارڈ (عالمی)

۱- نومبر ۱۹۷۶ء میں انٹر نیشنل اکیڈمی آف پوئٹس کے رکن منتخب ہوئے
۲- اگست ۱۹۷۶ء میں انٹر نیشنل رجسٹر آف پروفائل میں رجسٹریشن ہوئی
۳- جنوری ۱۹۷۷ء میں انگلستان سے انٹر نیشنل بیاگرافی مرتب کی گئی تو عرش صدیقی کا نام ادیب کی حیثیت سے شامل ہوا۔
۴- ۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۰ء میں آپ کی کارہائے نمایاں خدمات کے صلہ میں "WHO'S WHO" میں آپ کا نام درج تھا۔
۵- دسمبر ۱۹۸۲ء میں فقیر حسین امرتسری ایوارڈ میں آپ کے افسانوی مجموعے کا انعام ملا۔
۶- ۱۹۹۱ء انٹر نیشنل ڈائریکٹری آف ڈسٹنگویشڈ لیڈر شپ مرتبہ: امریکن بیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ یو ایس اے میں نمایاں مقام دیا گیا۔
۷- ڈاکٹر ارنیسٹ کی چانسلر اور ڈائریکٹر جنرل انٹر نیشنل بیوگرافیکل سنٹر کیمبرج کا خراج تحسین "آپ کا نام آرٹس کی دنیا میں نامی گرامی ہے"۔

اعزازات (قومی)

آدم جی ایوارڈ	(باہر کفن سے پاؤں)	۱۹۷۸ء
اہل قلم ایوارڈ	(ادب)	۱۹۸۲ء
عزمی ایوارڈ	(ممتاز دانشور)	۱۹۸۴ء
قومی فن کار ایوارڈ	(ادب)	۹۱ - ۱۹۹۰ء
رائٹرز پینل آف پاکستان	(ادب)	۱۹۹۴ء

سرکاری مصروفیات

ممبر نصاب کمیٹی	(انگریزی)	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسلام آباد
چیئرمین بورڈ آف سٹڈیز	(انگریزی)	بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان
ممبر بورڈ آف سٹڈیز	(انگریزی)	اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور
ممبر سلیکشن بورڈ	(انگریزی)	اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

ادبی مصروفیات

تاحیات رکن	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
سیکرٹری	پاکستان رائٹرز گلڈ
سیکرٹری	اردو اکادمی ملتان، ۱۷۔ اگست ۱۹۶۲ء تا ۲۵۔ جون ۱۹۶۶ء

تصانیف

دیدۂ یعقوب	جدید ناشرین، لاہور	۱۹۶۶ء
باہر کفن سے پاؤں	کاروانِ ادب، ملتان	۱۹۷۸ء
محبت لفظ تھا میرا	کاروانِ ادب، لاہور	۱۹۸۳ء
ہر موج ہوا تیز	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۵ء
اردو کے سات مسترد افسانے (مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی)	بیکن بکس، ملتان	۱۹۸۸ء
کالی رات دے گھنگرو (پنجابی شاعری)	تکوین پبلی کیشنز، ملتان	۱۹۹۱ء
کملی میں بارات مع پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء (عادل فقیر)	مقبول اکیڈمی، لاہور	۱۹۹۱ء
شعور سائنسی شعور اور ہم	بیکن بکس، ملتان	۱۹۹۲ء
تکوین	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور	۱۹۹۷ء
اسے کہنا دسمبر آگیا ہے	گورا پبلشرز، لاہور	۱۹۹۷ء
محاکمات	سارنگ پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۸ء
مرزا ادیب کی بہترین کہانیاں	میری لائبریری، لاہور	۱۹۶۳ء
سب رنگ	رائٹرز گلڈ، ملتان	۱۹۶۴ء
شاخِ نہال غم (انوار انجم)	الحمراء اکیڈمی، لاہور	۱۹۷۳ء
اقبال اور قائداعظم	ملتان یونیورسٹی، ملتان	۱۹۷۸ء
امیر علی کی سرگزشت	شاہین پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۵۵ء
دنیائے ادب کا عرش (مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی)	مکتبہ عالیہ، لاہور	۱۹۹۰ء

وفات

۸۔ اپریل ۱۹۹۷ء بروز منگل